الرسالہ

Al-Risāla

March 2005 • No. 340 • Rs. 10

دوسروں سے نفرت کرنا آدمی کو بزدل بناتا ہے، اور دوسروں سے محبت کرنا آدمی کو بہادر بنادیتا ہے۔

تذکیر القرآن

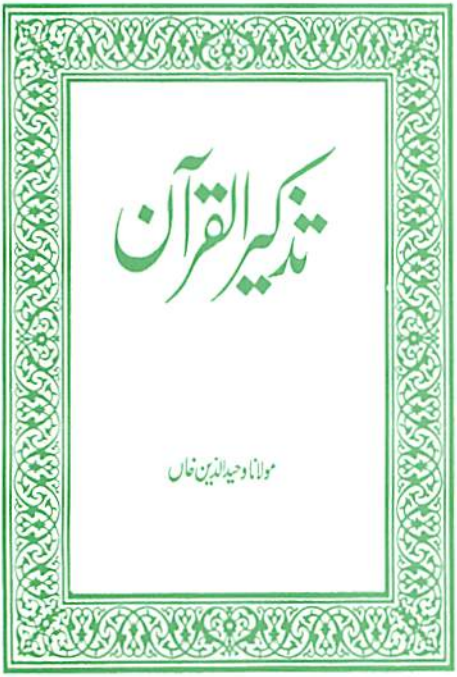

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al Risala

مارچ 2005

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333
email info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed In England by
IPCI: Islamic Vision
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

Distributed in the USA by
Al-Risala Forum International
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail:caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

مہاراشٹر کا سفر

مہاراشٹر کا سفر

ایک پروگرام کے تحت مہاراشٹر کا سفر ہوا۔ دہلی سے ۲ ستمبر ۲۰۰۴ کو روانگی ہوئی اور ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴ کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں مختلف تجربات پیش آئے۔ یہاں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲ ستمبر کی دوپہر کو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ اسٹیشن عام طور پر صاف نظر آیا۔ پلیٹ فارم پر سب سے زیادہ نمایاں آواز اناؤنسر کی تھی۔ وہ مسلسل مختلف ٹرینوں کے بارے میں وقت کا اعلان کر رہا تھا۔ اناؤنسمنٹ کے دوران مسافروں کو جو باتیں بتائی جا رہی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی:

We wish you a happy, comfortable and safe journey.

سفر کا آغاز سچکھنڈ اکسپریس کے ذریعہ ہوا۔ یہ ٹرین امرتسر اور ناندیڑ کے درمیان چلتی ہے۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے ٹرین ۱۵ منٹ کی تاخیر سے روانہ ہوئی۔ یہ ہندستانی معیار کے اعتبار سے کوئی قابل ذکر تاخیر نہ تھی۔ تاہم ٹرین کا تصور ہندستان میں اور ترقی یافتہ ملکوں میں بہت زیادہ مختلف ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ٹرین کا سفر ایک تفریح کے ہم معنٰی ہوتا ہے، جب کہ ہندستان میں ہر حال میں ٹرین کا سفر ایک مصیبت ہے، خواہ وہ اس کے اعلیٰ ترین درجہ میں کیوں نہ ہو۔

راستہ میں ہندی روزنامہ دینک بھاسکر کا شمارہ ۲ ستمبر ۲۰۰۴ موجود تھا۔ میرے ساتھی نے اس کو پڑھ کر سنایا۔ اس کے صفحۂ اول پر کم از کم تین خبریں ایسی تھیں جو ''مسلم دہشت گردی'' سے تعلق رکھتی تھیں۔ اخبار کی پہلی سرخی یہ تھی: تین بھارتیوں سمیت ساتوں بندھک رہا''۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ کچھ ہندستانی ٹرک ڈرائیور جو عراق میں کام کر رہے تھے وہ کویت کی ایک عرب کمپنی میں ملازم تھے۔ ان کو اغوا کیا گیا اور پھر ۵ لاکھ ڈالر کی ادائیگی پر انہیں رہا کیا گیا۔

اسی طرح صفحۂ اول کی ایک اور خبر کی سرخی یہ تھی: نیپال کی سب سے بڑی مسجد پھونکی۔ خبر کے مطابق، نیپال کے مزدوروں کو عراق کے مسلم جنگجوؤں نے پکڑ کر یرغمال بنالیا اور دھمکی دی کہ ہماری شرطیں مانو نہیں تو ہم ان کو ختم کر دیں گے۔ اس کا شدید ردعمل نیپال میں ہو رہا ہے۔ نیپالی لوگ وہاں

کی مسلم اقلیت سے نفرت کرنے لگے ہیں اور ان پر متشددانہ حملے شروع ہو گئے ہیں۔

صفحۂ اول کی ایک اور خبر ان الفاظ میں تھی: ۴۰۰ روسیوں کو اسکول میں بندھک بنایا۔ خبر کے مطابق، چیچنیا کے مسلم جنگجوؤں نے روس میں گھس کر ایک روسی اسکول کے طلبہ اور اساتذہ کو بندھک بنا لیا اور روسی ذمہ داروں سے کہا کہ ہماری مانگیں پوری کرو ورنہ ہم اسکول کو بم سے اڑا دیں گے۔ اس قسم کے واقعات جو آج کل مسلم مجاہدین کی طرف سے کئے جاتے ہیں وہ سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قطع طریق (رہزنی) کہا گیا ہے۔ اور قطع طریق اسلام میں جائز نہیں۔

آج صبح دہلی میں اسی موضوع پر ایک صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ یہ محمد خالد ندوی تھے جو آج کل سعودی عرب میں زیر تعلیم ہیں۔ میں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاد بمعنی قتال کا تعلق تمام تر باضابطہ طور پر قائم شدہ حکومت سے ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کو جہاد کے نام پر اس قسم کا متشددانہ عمل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بات یہ کہ بالفرض جہاد بمعنی قتال کی صورت پیدا ہو گئی ہو تب بھی اس کی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ مثلاً قرآن کے الفاظ میں، قوت مرہبہ کی فراہمی۔ اور جب قوت مرہبہ نہ ہو تو پھر صبر ہے یا پرامن جدوجہد۔

ٹرین اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آیا کہ ہریالی اس انتہائی وسیع کائنات میں ایک نادر استثناء کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہریالی زمین کا حسن ہے۔ تاہم نئے حالات میں اب اس قیمتی ہریالی کا تیزی سے خاتمہ ہو رہا ہے۔ میرے بچپن میں ہر طرف جنگل ہی جنگل دکھائی دیتا تھا۔ مگر اب ویسے جنگل بہت کم نظر آتے ہیں۔ میں نے ریلوے کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان میں پچھلے برسوں میں ٹرینیں تو بہت بڑھا دی گئی ہیں مگر پٹریاں (tracks) ابھی تک زیادہ تر وہی ہیں جو آزادی سے پہلے کے زمانہ میں بنائی گئی تھیں۔ اس کا ایک تجربہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ میں نے پایا کہ ٹرین مسلسل ہلتی ہوئی چل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پٹریاں بوڑھی ہو گئی ہوں اور ٹرین کا بوجھ مشکل سے اٹھا رہی ہوں۔

جو لوگ سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہیں وہ عوام کو خوش کرنے کے لیے یہ الفاظ بولتے ہیں کہ ہم

ورلڈ کلاس روڈ بنائیں گے، ورلڈ کلاس ریلوے بنائیں گے، ورلڈ کلاس ائرپورٹ بنائیں گے، وغیرہ۔ مگر جلد ہی آزادی کے ۶۰ سال پورے ہو جائیں گے اور اب تک ملک کی کوئی بھی چیز ورلڈ کلاس نہ ہو سکی۔ بلکہ عملاً اس کا الٹا ہو رہا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۷ سے پہلے برٹش دور میں کرپشن تقریباً نہیں کے برابر تھا۔ مگر اب کرپشن کا اتنا دور دورہ ہے کہ شاید کوئی کام بھی ملک میں ایسا نہیں جس میں کرپشن شامل نہ ہو گیا ہو، خواہ وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔

راستہ میں چار بجے متھرا کا ریلوے اسٹیشن آیا۔ نئی دہلی کے مقابلہ میں متھرا کا ریلوے اسٹیشن زیادہ صاف ستھرا دکھائی دیا۔ شاید اس کا سبب مذہبی ہو۔ متھرا مذہبی اعتبار سے ایک مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ شاید اس لیے ریلوے کی طرف سے متھرا کے ریلوے اسٹیشن کی صفائی کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہو۔

انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۲ ستمبر ۲۰۰۴) کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں مسٹر ترن وجے کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا جو نئی کانگریسی وزارت کے بارے میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نئی وزارت کے سامنے کیا کیا مسائل ہیں۔ اس سلسلہ میں مضمون میں یہ الفاظ درج تھے:

The need of the hour is for all those who have the nation's interest at heart to support Manmohan Singh with problems like Manipur, Islamic terrorism, the growing gap between the rich and the poor. There is no other alternative to a speedy infrastructure development and long over-due corrections in the system.

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے، خواہ وہ قومی سطح پر ہو یا بین اقوامی سطح پر، اس کی فہرست میں دوسری چیزوں کے ساتھ اسلامک ٹررزم کا لفظ بھی ضرور آتا ہے۔ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اس پر غصہ ہوتا ہے اور اس کو میڈیا کا پروپیگنڈا بتاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب مسلمان جگہ جگہ تشدد کلچر چلا رہے ہوں اور اس کام کو وہ اسلامی جہاد کا نام دے رہے ہوں تو میڈیا اس کو کس نام سے رپورٹ کرے گا۔ کیا وہ گن اور بم کے واقعہ کو گل پاشی کا نام دے گا، وہ تشدد کے واقعہ کو امن کے واقعہ کے طور پر رپورٹ کرے گا۔

مشہور انگریزی ماہنامہ فلم فئر (Film fare) کا شمارہ ستمبر ۲۰۰۴ ایک مسافر کے پاس تھا۔ اس

میں زیادہ تر تماشے کی باتیں تھیں۔ آج کل یہ حال ہے کہ عمدہ کاغذ اور کلر پرنٹنگ ہر میگزین کو ظاہری طور پر اتنا پرکشش بنا دیتے ہیں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بہت خاص چیز ہے۔ حالاں کہ معنوی قدر و قیمت اس میں بہت کم ہوتی ہے۔

اس میگزین میں مشہور فلم اسٹار شاہ رخ خان کا ایک انٹرویو تھا جس کا عنوان یہ تھا:

I don't live in lala land.

ایک سوال یہ تھا کہ کیا آپ اپنے فلمی پروفیشن کو ذمہ داری کے طور پر لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں شاہ رخ خان نے کہا کہ میں کسی خیالی دنیا میں نہیں رہتا۔ میں ایک عملی دنیا میں رہتا ہوں جہاں میں سال میں ۶۰۰ دن کام کرتا ہوں۔ رات دن میں ۱۸ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ خون پسینہ ایک کر کے فلم بناتا ہوں۔ فلم کا مقصد بزنس ہے:

I don't live in a utopion world. I live in a practical world where I work 600 days a year; 18 hours a day, put my blood and sweat into making a film. The business of film is business. (p. 30)

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام میں کامیابی کا راز محنت ہے۔ خواہ وہ فلمی کام ہو یا کوئی اور کام۔ یہ دنیا محنت کا کارخانہ ہے۔ محنت سے مراد صرف جسمانی محنت نہیں۔ سوچنا، منصوبہ بنانا، حالات کی رعایت کرنا، حقیقی اور غیر حقیقی میں فرق کرنا، یہ سب محنت میں شامل ہیں۔ راستہ میں ایک ریلوے افسر ہمارے ہم سفر تھے۔ وہ جھانسی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نام سی پی بھاٹیہ بتایا۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے: 2470183 (0517)

وہ نہایت ذہین مگر نہایت متواضع آدمی تھے۔ راستہ میں انہوں نے ہماری کسی فرمائش کے بغیر کئی معاملہ میں ہماری مدد کی۔ میں نے کہا کہ اس سفر میں میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ اے سی (AC) ہے۔ میں اے سی والی زندگی کا عادی نہیں ہوں۔ دہلی میں میرے کمرے میں نہ اے سی ہے اور نہ کولر۔ میرے گھر سے ملا ہوا پارک ہے۔ میں اس کی کھڑکی کھول دیتا ہوں اور اس کی طرف سے تازہ ہوا آنے لگتی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: بھگوان جی کا اے سی چلتا ہے

میرے ساتھی نے ان کو میرا کارڈ دیا جس پر سنٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی لکھا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر

مسٹر بھاٹیہ کی بیوی نے کہا کہ اسپر یچولٹی کے بارے میں ہمیں کچھ بتایئے۔ میں نے کہا کہ ہم ایک ہفتہ وار اسپر یچول کلاس دہلی میں چلاتے ہیں۔ ان کے مزید سوال پر میں نے بتایا کہ اسپر یچولٹی کا مقصد مَن کی شانتی ہے۔ خاتون نے پوچھا کہ آپ کا متھڈ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ دوسرے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کچھ جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سوچ کے عمل کو معطل کردیں اور اس طرح من کی شانتی حاصل کریں۔ میرا کہنا ہے کہ اس طرح کی شانتی تو جنگل کے جانوروں کو بھی ملی ہوئی ہے۔ اس قسم کی شانتی حیوانی سطح کی شانتی ہے۔ صحیح شانتی وہ ہے جو انسانی ذہن کی سطح پر ملے۔

میں نے کہا کہ انسان کی تمام سرگرمیاں، خواہ ان کا تعلق سوچ سے ہو یا احساس سے، سب کی سب دماغ سے جڑی ہوئی ہیں۔ جس طرح میمری (memory) دماغ کا ایک فنکشن ہے، روحانیت بھی اسی طرح دماغ کا ایک فنکشن ہے۔ عام طور پر جس چیز کو روحانیت سمجھا جاتا ہے وہ دراصل وجد (ecstasy) ہے۔ سچی روحانیت وہ ہے جو دماغ کی تشکیل نو (re-engineering of mind) کے ذریعہ حاصل ہو۔

دہلی سے ناندیڑ کا یہ سفر تقریباً ۲۶ گھنٹے کا سفر تھا۔ یہ ۲۶ گھنٹے میرے لیے ایک مصیبت کے ہم معنی تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں ایک ائرکنڈیشنڈ قید خانہ میں بند ہوں اور ایک مقرر مدت سے پہلے اس سے نکلنا میرے لیے ممکن نہیں۔ شاید اسی قسم کے تجربات کی بنا پر حدیث میں آیا ہے---الدنیا سجن المومن۔ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ میرے ائرکنڈیشنڈ ڈبہ کے باہر فطرت کی حسین دنیا تھی۔ ہرے بھرے مناظر، سورج کی روشنی، درختوں سے نکلنے والی تازہ ہوائیں، کھلی فضا، چڑیوں کی آوازیں وغیرہ۔ مگر میں مجبور تھا کہ فطرت کی اس حسین دنیا کے درمیان رہتے ہوئے بھی اس سے منقطع رہوں اور ائرکنڈیشنڈ ڈبہ کے اندر مصنوعی ماحول میں احساس مجبوری کے تحت پڑا رہوں۔

ٹرین لوہے کی پٹری پر مسلسل دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اسٹیشن آرہا تھا۔ اس دوران میرا ذہن تاریخ کے سفر میں گم ہوگیا۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا جب کہ میں یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں سواری کے نام پر صرف بیل گاڑی پائی جاتی تھی۔ مجھے وہ منظر یاد آیا

جب کہ گاڑی میں لگی ہوئی لوہے کی دُھری کے دونوں طرف سُتلی لپیٹی جاتی تھی اور اس کے اوپر تیل لگا کر اس میں لکڑی کے بھاری پہیے ڈالے جاتے تھے۔ پھر دو یا تین بیل نہایت مشقت کے ساتھ اس گاڑی کو لے کر چلتے تھے۔ اہل مغرب نے پہلی بار اس میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے غالباً سب سے پہلے یہ کیا کہ بال بیرنگ (ball bearing) بنائی اور اس کو پہیہ میں جوڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ربر کے ٹائر بنائے۔ ان چیزوں نے گاڑی کے چلنے کو بہت زیادہ آسان کر دیا۔ اب اس نئی گاڑی کو لے کر جانور سڑکوں پر تیزی سے دوڑتے ہیں۔ پھر اہل مغرب نے مکینیکل پاور (mechanical power) کو دریافت کیا۔ اس دریافت نے سواری کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ریل، موٹر کار، ہوائی جہاز، اسٹیم شپ وغیرہ، جیسی تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں۔

اہل مغرب نے دنیا کو بہت سی اس طرح کی قیمتی چیزیں دی ہیں۔ مسلمانوں نے دنیا کو توہمات (superstitions) کے دور سے نکالا تھا، اہل مغرب نے انسانیت کو سائنٹفک دور میں پہنچایا۔ زمانہ کی یہ تبدیلی عین اسلام کے حق میں تھی۔ مگر بدقسمتی سے یہ ہوا کہ ٹھیک اسی وقت بے خبر مسلم رہنماؤں کی ایک فوج ساری مسلم دنیا میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بے تکان مغرب اور مغربی تہذیب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ ان کا یہ منفی ردعمل اس عربی مقولہ کا مصداق تھا: الناس اعداء ما جھلوا (لوگ اس چیز کے دشمن ہو جاتے ہیں جس کو وہ نہ جانتے ہوں) اہل مغرب کے ذریعہ جو چیزیں ظہور میں آئیں ان کی حیثیت ایجاد (invention) کی نہ تھیں بلکہ ان کی حیثیت دریافت (discovery) کی تھیں۔ یہ دراصل فطرت کے چھپے ہوئے راز تھے جن کو اہل مغرب نے لمبی جستجو کے بعد معلوم کیا اور ان کو عام انسان کے لیے قابل استعمال بنایا۔ ان دریافتوں کے بہت سے مفید پہلو تھے مگر غالباً اس کا سب سے زیادہ مفید پہلو یہ تھا کہ ان دریافتوں کے ذریعہ فطرت میں چھپی ہوئی خدائی نشانیاں سامنے آگئیں۔ اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ خدا کی معرفت کو زیادہ گہری سطح پر حاصل کیا جا سکے۔ ان دریافتوں نے معرفت کے فریم ورک کو بہت بڑھا دیا۔ پہلے خدا کی معرفت صرف روایتی فریم ورک کے ذریعہ ممکن ہوتی تھی۔ اب یہ معرفت سائنٹفک فریم ورک کے ذریعہ ممکن ہو گئی۔

اس نئے فریم ورک نے معرفت کے اعلیٰ دروازے کھول دیئے۔ خدا کی معرفت، جنت کی معرفت، پیغمبر کی معرفت، قرآن کی معرفت، ہر چیز کی معرفت کے لیے ایک نیا زیادہ گہرا فریم ورک دستیاب ہوگیا۔ مثال کے طور پر قرآن کا پہلا کلمہ یہ ہے: الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی شکر ہے اس خدا کا جو سارے عالم کا رب ہے۔ شکر کا یہ احساس بلاشبہہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ شکر اس عبادتی کیفیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

مثلاً راستہ میں مجھے پیاس لگی۔ مجھے پلاسٹک کی شفاف بوتل میں پیک کیا ہوا پانی دیا گیا۔ اس صاف وشفاف پانی کو دیکھ کر قدیم زمانہ کا انسان بھی کہتا تھا الحمد للہ۔ مگر آج کے انسان کے سامنے جب پانی آتا ہے تو اس کے ذہن میں علم الماء کی ایک پوری کائنات گھوم جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ انتہائی وسیع کائنات میں ہماری زمین ہی وہ چھوٹا سا کرہ ہے جہاں پانی جیسی قیمتی چیز موجود ہے۔

پھر وہ سوچتا ہے کہ کس طرح کائناتی سطح پر بہت سے واقعات ہوئے جن کے نتیجہ میں دو غیر سیال گیسوں کے ملنے سے سیال پانی بنا۔ پھر عجیب وغریب آفاقی نظام کے تحت اس پانی کے ذخیرے زمین کے اندر اور اس کے باہر محفوظ ہوگئے اور پھر بارش کے نظام کے تحت مسلسل اس ذخیرے کو تازہ رکھنے کا نظام قائم ہوا، وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے ایک ہم سفر مسٹر گوپال کرشن دوارکا تھے۔ وہ الکٹریکل انجینئر ہیں اور چار سال جرمنی میں رہے ہیں۔ آج کل وہ دہلی میں مقیم ہیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ میں پہلے پبلک سیکٹر میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہمارے لیڈر روس کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے ملک کی اکانومی کو روس کی مدد سے چلانا چاہا مگر روس خود ٹکنالوجی کے اعتبار سے پچھڑا ہوا ملک تھا۔ ہمارا دیش آگے نہ بڑھ سکا۔ اس روسی جھکاؤ نے ہمارے دیش کو دو تحفے دئے۔ ایک اکنامک پچھڑاپن اور دوسرے بھرشٹاچار۔

انہوں نے کہا کہ مسٹر راجیو گاندھی نے اس ٹرنڈ (trend) کو بدلنا شروع کیا۔ اس کے بعد نرسمہاراؤ کے زمانہ میں ڈاکٹر من موہن سنگھ نے اس کو آگے بڑھایا۔ اس وقت کانگریس کے لوگ

من موہن سنگھ کے مخالف تھے۔ کیوں کہ لائسنس۔ پرمٹ راج کے سسٹم میں ان کا انٹرسٹ جڑ گیا تھا۔ مگر نرسمہاراؤ نے ڈاکٹر من موہن سنگھ کی زبردست مدد کی۔ اس طرح یہ پالیسی آگے بڑھی۔ پھر بی جے پی کے زمانہ میں کھلے پن کی پالیسی کو اور زیادہ بڑھاوا ملا۔ پہلی بار ہمارا بدیشی کرنسی کا بھنڈار بہت بڑھ گیا۔ اب ڈاکٹر من موہن سنگھ اس کو اور آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر خود کانگریسیوں کی طرف سے ان کو مخالفت کا سامنا ہے۔ اسی کے ساتھ لفٹسٹ پارٹیوں کی بھی مخالفت چل رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آزادی کے بعد فوراً ہی کھلے پن کی پالیسی اپنائی گئی ہوتی تو آج ہمارا دیش چین سے بھی آگے ہوتا اور دنیا کے چند بڑے دیشوں میں اس کا شمار ہوتا۔

کسی قوم کی زندگی میں صحیح آغاز کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ صحیح آغاز کا مطلب گاڑی کو صحیح سمت میں روانہ کرنا ہے۔ جو گاڑی اپنے آغاز میں صحیح سمت میں روانہ ہو اس کا ہر لمحہ آگے کی طرف بڑھنے کے ہم معنی ہے۔ اس کے برعکس اگر نقطۂ آغاز صحیح نہ ہو تو ہر اگلا لمحہ منزل سے دوری کے ہم معنی بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو ایک شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

خشت اول گر نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب کبھی کوئی قومی نظام بنتا ہے تو اس سے کچھ لوگوں کے انٹرسٹ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً انڈیا میں بیوروکریسی کا انٹرسٹ اور پاکستان میں فوجی افسروں کا انٹرسٹ۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ قائم شدہ نظام میں ان کو ہر قسم کے فائدے مل رہے ہیں تو وہ اس میں تبدیلی کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ یہ نظام باقی رہے تاکہ ان کے مفادات پر کوئی زد نہ پڑے۔ اس طرح ایک محدود گروہ کو تو خوب فائدے ملتے ہیں مگر بقیہ لوگ محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پچھلے برسوں میں موبائیل ٹیلی فون کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی بار مسافروں کے موبائیل کی گھنٹی بجی اور لوگ دور کے مقام سے بات کرنے لگے۔ موبائیل ٹیلی فون کی دریافت سے پہلے یہ ناقابل تصور تھا کہ کوئی شخص چلتی ہوئی ٹرین میں دور سے بات کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونی کیشن خدا کی ایک عجیب نعمت ہے۔ اس نعمت کو لاکھوں لوگ استعمال کر رہے ہیں مگر میں

نے اب تک کسی کو نہیں پایا جو اس انوکھی نعمت پر شکر کے جذبے سے سرشار ہو۔

ٹرین میں ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب گیتا نجلی کا ذکر کیا۔ میں نے ٹیگور اور گیتا نجلی کے بارے میں کچھ اظہار خیال کیا۔ اس پر ان کے ساتھی نے کہا کہ تم کیا بات کر رہے ہو۔ یہ تو خود رابندر ناتھ ٹیگور ہیں:

He himself is like Rabinder Nath Tagore.

میں نے پایا کہ ہندو لوگوں میں اعتراف کا مادہ دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو لوگوں میں خدا اندر (indwelling God) کا تصور ہے۔ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق، ہر انسان کو خدا کا انش سمجھتے ہیں۔ گویا وہ پہلے ہی سے ہر انسان کے اعتراف میں جیتے ہیں۔ اس لیے جب بھی کسی انسان سے ان کا سابقہ پڑتا ہے تو اس کا اعتراف کرنے میں ان کے لیے کوئی مانع نہیں ہوتا، وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی دیوتا کے آگے جھکنا۔

حیدرآباد کے اردو روزنامہ منصف (۳ ستمبر ۲۰۰۴) میں لکھنؤ کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی۔ اس رپورٹ کا عنوان یہ تھا: عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کی تشریح وقت کا اہم تقاضا۔ اس رپورٹ کا ابتدائی حصہ یہ تھا: ''اسلامی شریعت مکمل ہو چکی ہے، اس میں ذرہ برابر تبدیلی کی گنجائش نہیں، البتہ زمانہ کے اسلوب اور مزاج کے مطابق اس کی تشریح کی گنجائش ہے اور یہ علماء کا فریضہ ہے کہ شریعت کے مسلمہ اصول وضوابط سے ہر دور کے نئے مسائل کا حل پیش کریں اور امت کے لیے آسانی پیدا کریں۔'' المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد'' کے ریسرچ اسکالر مولانا منور سلطان ندوی کی کتاب'' ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابناء ندوۃ کی فقہی خدمات'' کے رسم اجراء کی تقریب کے موقع پر صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ان خیالات کا اظہار کیا''۔

مذکورہ تقریر میں ایک طرف یہ کہا گیا کہ اسلامی شریعت ایک مکمل شریعت ہے۔ اس میں ذرہ برابر تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف اسی تقریر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ البتہ زمانی تقاضوں کے

مطابق، اس میں تشریح (واجتہاد) کی گنجائش ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ اگر شریعت مذکورہ معنوں میں مکمل ہے تو پھر اس میں کسی نئی چیز کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگر اس میں نئی چیز کی گنجائش باقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مکمل نہیں۔

یہ بظاہر تضاد ایک غلط تقسیم (wrong dichotomy) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ معاملہ مکمل شریعت اور ناقص شریعت کا نہیں ہے بلکہ وہ بنیادی شریعت اور تفصیلی شریعت کا معاملہ ہے۔ اصولی تعلیمات کے لحاظ سے شریعت بلاشبہ مکمل ہے مگر قوانین کی فہرست کے اعتبار سے شریعت نہ تو ''مکمل'' ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ لوگوں نے یہ غلط مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ شریعت اصول کے علاوہ احکام و قوانین کے اعتبار سے بھی پوری طرح مکمل ہے۔ اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں اجتہاد یا قانونی اضافہ یا تبدیلی کیسے کی جائے۔ حالاں کہ خود یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔

ٹرین ۳ ستمبر کی شام کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہوکر ناندیڑ پہنچی۔ مسٹر اے کے پانڈے ریلوے میں انجن کے میکینک ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ٹرین لیٹ ہونے کا سبب کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ منماڈ سے ناندیڑ تک ایک ہی پٹری ہے جس پر تمام گاڑیاں چلتی ہیں۔ ہر گاڑی کے آگے اور پیچھے کئی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی ایک گاڑی کے ساتھ کوئی پرابلم ہو اور اس کو کسی اسٹیشن پر روکنا پڑے تو اس کا اثر تمام گاڑیوں پر پڑتا ہے۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ تمام پٹریوں کو ڈبل کردیا جائے۔ انڈیا میں مین لائنوں پر تو ڈبل پٹریاں بنائی گئی ہیں مگر دوسری لائنوں پر ابھی ایسا نہیں ہوا۔ ہماری منزل ناندیڑ تھی مگر ابھی ٹرین پربھنی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تھی کہ الرسالہ کے لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ پربھنی سے کئی لوگ اس ٹرین میں مجھ سے ملنے کے لیے سوار ہوئے۔ ہمارے ڈبہ کے ٹکٹ کلکٹر ایک مسلمان تھے جن کا نام حمید الدین تھا۔ میں ان کو نہیں جان سکا تھا مگر انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ جو لوگ پربھنی میں سوار ہوئے ان کو میرے پاس پہنچانے میں انہوں نے مدد کی۔ اس طرح ٹرین کے اندر ہی الرسالہ کے قاریوں کی مجلس شروع ہوگئی۔

یہ سب الرسالہ کے قاری تھے۔ ان سے ٹرین کے اندر تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو کا سلسلہ جاری

رہا۔ایک بات میں نے یہ کہی کہ خدا کے نزدیک سب سے بری چیز منافقت ہے۔قرآن میں ہے: ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار۔منافقت درحقیقت دوعملی(duplicity) کا نام ہے۔آدمی کو ہمیشہ اپنے کانشنس (ضمیر) کے مطابق جینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں ضمیر کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ۱۹۶۲ میں میں نے جماعت اسلامی صرف اسی لیے چھوڑی تھی۔ مجھ کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تعبیر دین سے اختلاف ہوا۔ اس وقت جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں نے مجھ سے کہا کہ آپ کے جو خیالات ہیں انہی خیالات کے ساتھ آپ جماعت اسلامی میں رہیے۔آپ جماعت اسلامی کو نہ چھوڑیئے۔تاہم میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو اہمیت دی اور جماعت اسلامی سے علیٰحدگی اختیار کرلی۔

میں نے کہا کہ اس طرح کے مواقع میری زندگی میں بار بار پیش آئے ہیں۔پچھلے سالوں میں مجھے نئی دہلی کی حکومت کی طرف سے گورنر کے عہدے کی پیش کش کی گئی مگر میں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اسی طرح مجھے راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کردیا گیا اور اخباروں میں باقاعدہ اس کا اعلان بھی آگیا۔مگر میں نے اس کو بھی قبول نہیں کیا۔ حالاں کہ لوگ کروڑوں روپیہ کا عطیہ دے کر راجیہ سبھا کے ممبر بنتے ہیں جب کہ میں نے اشارۃً بھی اس کی خواہش نہیں کی۔ایسا میں نے صرف اس لیے کیا کہ کسی بڑے سرکاری عہدہ کی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے ہمیشہ ضمیر کی آواز کو دبانا پڑتا ہے۔

مسٹر عبدالرحمٰن چاؤش نے کہا کہ میں نے یہ بات اخبار میں پڑھی ہے۔اُنہوں نے ایک ہندی پرچہ کا حوالہ دیا جس میں یہ بات چھپی ہے کہ میں نے گورنری اور راجیہ سبھا کی ممبری دونوں کو لینے سے انکار کردیا، جب کہ یہ عہدے مجھے میری درخواست یا خواہش کے بغیر دیے جارہے تھے۔مسٹر عبدالرحمٰن نے بعد کو مجھے دو ہندی پرچوں کی فوٹو کاپی بھیجی جن میں میرے بارہ میں یہ بات چھپی ہوئی تھی۔ وہ پرچے یہ ہیں: لوک مت سماچار، ۸ ستمبر ۲۰۰۴۔آؤٹ لک، ۱۰ مئی ۲۰۰۴۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ تبلیغی جماعت کے مخالف ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ میں تبلیغی جماعت کو پسند کرتا ہوں اور اس کی تائید میں بار بار لکھ چکا

ہوں۔ البتہ مجھے ایک چیز سے اتفاق نہیں۔ تبلیغی جماعت والے اپنے کام کو دعوت کہتے ہیں۔ حالاں کہ تبلیغی جماعت کا کام دعوت نہیں ہے بلکہ وہ اصلاح امت کا کام ہے۔ دعوت وہ کام ہے جو عام انسانیت کے لیے کیا جائے۔ تبلیغی جماعت میں اکرام مسلم اور امت پنا کا اصول ہے۔ یہ اصول اصلاح امت کے کام سے مطابقت رکھتا ہے۔ دعوت کا کام اکرام انسان اور انسانیت پنا جیسے آفاقی اصول کا تقاضا کرتا ہے جو کہ تبلیغی جماعت میں موجود نہیں۔

مجلس میں ایک صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے کو الرسالہ کا قاری بتایا مگر وہ بات کو کاٹ کر درمیان میں بار بار سوال کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک آپ الرسالہ کے قاری نہیں ہیں۔ زیادہ سوال کرنا الرسالہ کے مزاج کے خلاف ہے۔ الرسالہ کا مقصد ذہن بنانا ہے۔ جو لوگ الرسالہ کو گہرائی کے ساتھ پڑھیں ان کا ذہن اس طرح تیار ہو جاتا ہے کہ وہ خود ہی سوالات کا جواب پا لیتے ہیں۔ وہ سوال کرنے سے زیادہ سوچنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ سوال کرنا بات کو ہضم کیے بغیر بولنا ہے۔ اگر آپ بات کو ہضم کرنا سیکھ لیں تو آپ کا ذہن خود ہر سوال کا جواب پالے گا۔

ناندیڑ کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو بہت سے لوگ پلیٹ فارم پر ملنے کے لیے موجود تھے۔ یہ تمام لوگ الرسالہ کے قاری تھے۔ ان میں سے کئی لوگ گلدستہ یا پھولوں کا ہار لے کر وہاں پہنچے تھے۔ میں نے سب کو منع کر دیا اور سلام و مصافحہ پر اکتفا کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے قافلہ کی صورت میں روانہ ہو کر ہم لوگ مسٹر عبد الرحمٰن چاؤش کے مکان پر پہنچے۔ ناندیڑ میں میرا قیام انہی کے گھر پر تھا۔ یہاں دوبارہ لوگ اکھٹا ہو گئے۔ ان لوگوں سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ بات شروع کرنے سے پہلے میں نے ہر ایک سے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی تجربہ بتائیں۔ میں نے کہا کہ خلیفہ دوم عمر فاروق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کان یتعلم من کل احد (وہ ہر ایک سے کچھ سیکھتے تھے)۔ اس سیکھنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ لوگوں سے ان کے اپنے تجربات پوچھتے تھے اور اس کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے تھے۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ جب بھی میری ملاقات کسی شخص سے ہوتی ہے تو سب سے پہلے میں اس سے

یہی کہتا ہوں کہ اپنے کچھ تجربات بتایئے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لڑنے بھڑنے کا طریقہ کبھی مفید نہیں ہوتا۔ البتہ ایک مثال ہے جب کہ لڑائی سے ایک نتیجہ نکلا اور وہ بنگلہ دیش کا بننا ہے۔ میں نے کہا کہ نتیجہ سے مراد مثبت نتیجہ (positive result) ہے۔ بنگلہ دیش کی لڑائی سے بنگلہ دیش تو بن گیا مگر اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ مثبت رزلٹ یہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے دعویٰ کے مطابق، بنگلہ دیش سونار بنگلہ (Golden Bangla) بنتا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، نتیجہ برعکس صورت میں سامنے آیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن اس کے بانی تھے۔ ان کا نعرہ تھا: سونار بنگلہ (گولڈن بنگلہ دیش)۔ مگر عملاً جو بنگلہ دیش بنا وہ کرپٹ بنگلہ دیش تھا۔ مختلف مقامی اسباب کی بنا پر بنگلہ دیش کے لوگوں کی معاشیات کا گہرا تعلق کلکتہ اور مغربی بنگال سے تھا۔ مگر بنگلہ دیش بننے کے نتیجہ میں وہاں کے لوگ اس سے کٹ گئے اور غربت ان کا مقدر بن گئی۔ میں نے کہا کہ کسی بھی اقدام کی صحت کو جانچنے کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس اقدام سے کوئی مثبت رزلٹ نکلا یا نہیں۔

ناندیڑ کا علاقہ ۱۹۴۷ سے پہلے حیدرآباد اسٹیٹ کا ایک حصہ تھا۔ یہاں آزاد حیدرآباد کی تحریک چلائی گئی۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ تحریک پوری طرح ناکام رہی۔ یہاں تک کہ اس کے لیڈر مسٹر قاسم رضوی بھاگ کر پاکستان چلے گئے۔ میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ناندیڑ کی جو اقتصادی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج وہ بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ آزاد حیدرآباد جیسی تحریک چلانا صرف ایک دیوانگی کا فعل تھا نہ کہ فرزانگی کا فعل۔

ایک صاحب نے کہا کہ مومن کے صبح وشام کس طرح گزرنے چاہئیں۔ میں نے کہا کہ حدیث میں اس کا جواب موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان صحابی سے کہا: **یا بنی ان تستطیع ان تصبح و تمسی و لیس فی قلبك غش لاحد فافعل**۔ (اگر تم ایسا کر سکو کہ تم صبح اور شام اس طرح کرو کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف بغض نہ ہو تو ضرور تم ایسا کرو) میں نے کہا کہ ایک شخص کے دل میں کسی کے خلاف بغض اور نفرت کب پیدا ہوتا

ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ کوئی ناراضگی کی بات پیش آجائے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تم کو کسی کے خلاف ناراضگی کیوں نہ ہو تم اس کے معاملہ میں اپنے آپ کو منفی نفسیات کا شکار ہونے سے بچاؤ۔ تم ہر حال میں مثبت نفسیات کے ساتھ جیو۔

ناندیڑ کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ اس میں ۳۵ فیصد مسلمان ہیں۔ کچھ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مشترک آبادی میں رہتے ہیں اور زیادہ مسلمان الگ پاکٹ کی صورت میں رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جو مسلمان علیحدہ پاکٹ کی صورت میں رہ رہے ہیں وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکے۔ لیکن جو لوگ ہندوؤں کے ساتھ مشترک آبادی میں رہتے ہیں انہوں نے مقابلۃً زیادہ ترقی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انٹریکشن اور مل جل کر رہنے میں بہت زیادہ فائدے ہیں۔ تمام فکری اور عملی ترقیاں اسی سے جڑی ہوئی ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ فطرت کے اس راز کو موجودہ زمانہ کے کسی بھی مسلم رہنما نے نہیں سمجھا۔ پاکستان، فلسطین، بنگلہ دیش، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپائن، اراکان، وغیرہ سب اسی بے دانشی کی مثالیں ہیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے میں ناندیڑ نہیں آیا تھا۔ البتہ ۱۹۴۷ سے پہلے ایک بار ٹرین میں سفر کرتے ہوئے میں اس علاقہ سے گزرا تھا۔ اس وقت ناندیڑ نظام اسٹیٹ کا حصہ تھا۔ اب وہ آزاد ہندستان کا حصہ ہے۔ اس مشاہدہ میں میں نے جو اندازہ کیا تھا اس کے مطابق آج کا ناندیڑ پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ اس ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو برابر کا حصہ ملا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں میں عبدالرحمٰن صاحب کے گھر پر ٹھہرا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ۱۹۴۷ میں آپ کے خاندان کی اقتصادی حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آج ہم اللہ کے فضل سے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی تقریباً تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ ایسی حالت میں یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خدا کا شکر کریں نہ کہ قدیم نظام اسٹیٹ کو یاد کر کے آہ بھرتے رہیں۔

ناندیڑ میں ثنا ہائر سکنڈری اسکول کا آغاز ۱۹۹۲ میں ہوا تھا۔ وہ یہاں کا ٹاپ کا اسکول سمجھا جاتا

ہے۔ ۴ ستمبر ۲۰۰۴ کو ۱۱ بجے یہاں ایک جلسہ ہوا۔ اس میں طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ شہر کے لوگوں کی بھی قابل لحاظ تعداد شریک ہوئی۔ یہاں مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ خطاب اور سوال و جواب تقریباً ۲ گھنٹہ تک جاری رہا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ تعلیم کی اہمیت بتائی۔ میں نے بتایا کہ تعلیم صرف سروس کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ تعمیر شعور کے لیے ہوتی ہے۔ تعلیم آدمی کے اندر فکر صحیح پیدا کرتی ہے اور فکر صحیح والا آدمی ہی معاملات میں صحیح فیصلہ لے سکتا ہے۔

میں نے حضرت علی کا ایک قول سنایا: قیمة المرء ما یحسنه (یعنی آدمی کی قدر و قیمت اس کے امتیازی عمل میں ہے (The value of a person lies in excellence)

میں نے کہا کہ اس قول کی روشنی میں میں آپ کو زندگی کی کامیابی کا ایک سادہ فارمولا دیتا ہوں۔ آپ اس کو اختیار کرلیں تو آپ زندگی میں کبھی ناکام نہ رہیں گے۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ: بہتر کرو اور بہتر پاؤ (Do your best and find the best)

تقریر کے بعد کثرت سے سوالات کئے گئے۔ یہ سوالات زیادہ تر طلبہ کی طرف سے کئے گئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ تمام سوالات سنجیدہ سوالات تھے۔ میرے جواب کے بعد کسی نے بھی کراس کوئشچن نہیں کیا۔ جلسہ گاہ میں کافی لوگ موجود تھے مگر پوری کارروائی نہایت پرسکون طور پر ہوئی۔

مسٹر عبدالرحمٰن چاؤش نے سوال کیا کہ دعوت الی اللہ فرض عین ہے یا فرض کفایہ۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ فرض عین اور فرض کفایہ کی اصطلاح قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ یہ اصطلاح بعد کو فقہ میں وضع ہوئی ہے۔ تاہم جہاں تک دعوت الی اللہ کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ اس تقسیم کے دائرہ میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ ہر حال میں فرض ہے۔ وہ کسی بھی حال میں اور کسی بھی شخص سے ساقط نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک غیر استمراری مسئلہ اور دوسرا استمراری مسئلہ۔ فرض کفایہ کا اصول غیر استمراری مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ استمراری مسئلہ میں فرض علی الکفایہ کا اصول قابل انطباق نہیں۔ اور دعوت الی اللہ کا کام اسی استمراری نوعیت سے تعلق رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بستی میں کنواں نہیں ہے۔ لوگ پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور سخت

ضرورت ہے کہ وہاں کنواں کھودا جائے۔ اب اگر کچھ لوگ کنواں کھود کر پانی کا انتظام کردیں تو انہوں نے گویا سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا۔ اب اس کا فریضہ دوسروں کے اوپر نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر بستی میں ایک مسلمان کی موت آجائے اور اس کا مردہ جسم لاوارث پڑا ہوا ہو تو اس کی تجہیز و تکفین اس وقت تک ساری بستی پر فرض رہے گی جب تک کہ وہ عملاً ہو نہ جائے۔ لیکن اگر کچھ لوگ اس کی تجہیز و تکفین کردیں تو گویا انہوں نے دوسروں کی طرف سے ان کا فرض ادا کردیا۔ اب دوسروں کے اوپر سے اس کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی۔ مگر دعوت الی اللہ کا کام ایک استمراری نوعیت کا کام ہے۔ دعوت کا تعلق انسانوں سے ہے اور انسان ہر روز مرتے ہیں اور ہر روز نئے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے دعوت کی ضرورت ہر جگہ اور ہر وقت جاری رہے گی۔ اس کا تعلق کسی محدود وقت سے نہیں ہے کہ اس محدود وقت میں اس کام کو کردیا جائے تو اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلسہ کے بعد طلبہ اور طالبات کی طرف سے جو سوالات کیے گئے ان کی کل تعداد ۴۲ تھی۔ میں نے ہر سوال کا جواب دیا۔ یہاں کچھ منتخب سوالات اور ان کے جوابات درج کیے جاتے ہیں:

سوال: اسلام میں دینی علم و دنیاوی علم میں تفریق ہے کہ نہیں۔ علم نافع اور علم غیر نافع میں کیا فرق ہے۔

جواب: دینی علم اور دنیاوی علم میں فرق نیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ خود علم کے اعتبار سے۔ ہر علم ایک جائز علم ہے بشرطیکہ اس کو صحیح مقصد کے لیے حاصل کیا جائے۔ اسی طرح علم کا نافع ہونا یا غیر نافع ہونا خود علم کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اس کے استعمال کے اعتبار سے ہے۔ صحیح استعمال کسی علم کو نافع بناتا ہے اور غلط استعمال اس کو غیر نافع بنا دیتا ہے۔

سوال: ایسا کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کی ترقی کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کی ترقی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

جواب: میرے لیے یا میرے مشن کے لیے ترقی کا لفظ کوئی درست لفظ نہیں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ خدا کی ایک بے حد خصوصی مدد تھی کہ مجھے افکار کے جنگل میں صحیح فکر کی دریافت ہوئی اور پھر یہ بھی خدا کی خصوصی مدد تھی کہ انتہائی غیر موافق حالات میں مجھے یہ ہمت ہوئی کہ میں

بے آمیز سچائی کے لیے کھڑا ہوں اور غیر مصالحتی انداز میں اس کے لیے کام کروں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک باب ہے۔

سوال: اکثر کہا جاتا ہے کہ ماں باپ کی فرماں برداری کرو۔ اگر ماں باپ نے تعلیم حاصل کرنے سے منع کر دیا تو یہ سننا ضروری ہے یا نہیں۔

جواب: قرآن میں ہے کہ ماں باپ اگر توحید سے روکیں تو تم ان کی بات نہ مانو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وسیع تر انطباق کے اعتبار سے علم بھی اس میں شامل ہے۔ کیوں کہ علم کے بغیر آدمی خدا کی سچی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک فارسی شاعر نے درست طور پر کہا ہے:

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

سوال: اعلیٰ تعلیم کا مطلب موجودہ دور میں صرف ڈاکٹر اور انجینیر بننا ہی کیوں سمجھا جاتا ہے۔

جواب: تعلیم کو اگر پروفیشنل تعلیم کے معنی میں لیا جائے تو یہ خیال درست ہوگا۔ مگر میرے نزدیک اعلیٰ تعلیم اعلیٰ شعور ہے۔ میرے نزدیک اعلیٰ تعلیم یافتہ وہ ہے جس کو اس کی تعلیم نے اعلیٰ شعور دیا ہو۔ تعلیم کے بارے میں اس قسم کی سوچ کا سبب یہ ہے کہ لوگ تعلیم یافتہ اور ڈگری یافتہ کے فرق کو نہیں سمجھتے۔

سوال: آپ اپنی زندگی کا کوئی ایسا یادگار واقعہ بتائیے جس سے طالب علم کوئی نصیحت حاصل کر سکے۔

جواب: غالباً ۱۹۴۰ میں میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو میری پوری زندگی کے لیے ایک رہنما واقعہ بن گیا۔ یہ واقعہ میں نے اپنی کتاب دین وشریعت (صفحہ ۱۴۰۔۱۴۱) میں درج کیا ہے۔ اس طرح اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں میرے اندر وہ چیز پیدا ہوگئی جس کو روح تجسس (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ روح تجسس کی حیثیت علمی ترقی میں بہت بنیادی ہے۔ چنانچہ میری بعد کی زندگی میں اس واقعہ کا دخل بہت زیادہ ہے۔

سوال: کیا یہ فتویٰ صحیح ہے کہ اگر کوئی مسجد ہے تو قیامت تک وہ مسجد ہی رہے گی۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ نے یہ کیوں کہا کہ ''مسلمانوں کو بابری مسجد سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔

جواب: میں نے مسجد سے دست برداری کی بات نہیں کہی تھی بلکہ مسجد کے اشو پر احتجاجی سیاست کو چھوڑنے کی بات کہی تھی۔ جہاں تک علماء کے فتویٰ کا تعلق ہے وہ بجائے خود درست ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ ہر کلیہ کا ایک استثناء ہوتا ہے۔ فقہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ: تتغیر الأحکام بتغیر الزمان والمکان، اور یہ کہ الضرورات تبیح المحظورات۔ اس بنا پر میری رائے ہے کہ اگر ضرورت شدیدہ پیش آجائے تو مسجد کے مقام کی تبدیلی (relocation) جائز ہے۔ عرب ملکوں میں سینکڑوں مسجدوں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔

سوال: آپ کے تعلیم حاصل کرنے میں والدین کا کیا کردار تھا۔

جواب: میرے والد کا انتقال اس وقت ہوگیا جب کہ میری عمر صرف پانچ سال تھی۔ البتہ میری تعلیم میں میرے چچا صوفی عبد الحمید کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میرے خاندان میں انگریزی تعلیم کا رواج تھا۔ خاندانی ماحول کے اعتبار سے غالباً میں کسی اسکول میں داخل کر دیا جاتا اور پھر میری زندگی کا رخ بالکل دوسرا ہوتا۔ مگر میرے چچا صوفی عبد الحمید صاحب نے دینی تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے ذاتی خرچ پر مجھے مدرسہ میں داخل کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی اعتبار سے میری زندگی میں صوفی عبد الحمید خاں مرحوم کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سوال: معلوماتی فلم دیکھنا کیا اسلام میں جائز ہے۔

جواب: میرے نزدیک معلوماتی فلم کو دیکھنا جائز ہے۔ اسلام میں سب سے بڑی ناجائز بات یہ ہے کہ ہر بات کو جائز اور ناجائز کا مسئلہ بنایا جائے۔ اس معاملہ میں فقہ کا یہ اصول ایک مستقل رہنما کی حیثیت رکھتا ہے کہ: الأصل فی الأشیاء الإباحة۔ چیزوں میں اصل ان کا جائز ہونا ہے۔ یعنی جس چیز کو قرآن وحدیث میں ناجائز نہ بتایا گیا ہو وہ اصولاً جائز قرار پائے گی۔

سوال: ایک پختہ انسان کے لیے کون سی صفات درکار ہیں۔

جواب: میرے تجربہ کے مطابق، پختگی (maturity) کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ مثلاً یہ فرق کہ کسی مقصد کو نظریاتی طور پر بیان کرنا ہو تو

آئیڈیلزم کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی مقصد کے لیے اقدام کرنا ہو تو عملی صورت حال (practical situation) کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یعنی نظری وضاحت کے وقت آدمی آئیڈیل ہوسکتا ہے مگر عملی کارروائی کے وقت اس کو پریکٹکل بننا پڑتا ہے۔

سوال: ۱۱ ستمبر کے بعد ہر جگہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جارہا ہے۔ گجرات میں جو کچھ ہوا اور کچھ دن پہلے مساجد میں بم بلاسٹ ہوئے ہیں۔ کیا یہ دہشت گردی نہیں ہے۔

جواب: ۱۱ ستمبر کو نیویارک میں تشدد کا جو بھیانک واقعہ ہوا اس کو ثابت شدہ طور پر مسلمانوں نے کیا تھا۔ ایک حالیہ ٹیپ کے مطابق، اسامہ بن لادن نے خود یہ کہا ہے کہ لبنان کی تباہ شدہ مسلم عمارتوں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں یہ انتقامی جذبہ آیا کہ نیویارک ورلڈ ٹاور کو تباہ کیا جائے۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ساری مسلم دنیا میں میں واحد مسلمان تھا جو اس غیر اسلامی فعل پر تڑپا اور اس کی مذمت کی۔ غالباً مسلم دنیا میں کوئی ایک شخص نہ تھا جو کھلے الفاظ میں اس غیر اسلامی فعل کو کنڈم کرے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری قوموں کے لوگ بھی تشدد کے واقعات میں ملوث ہیں مگر دوسروں کا تشدد مسلمانوں کو یہ جواز فراہم نہیں کرتا کہ وہ بھی تشدد کرنے لگیں۔

سوال: ''علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے'' کیا یہ حدیث صحیح ہے۔ اگر صحیح ہے تو کون سے علم کے بارے میں ہے۔ کیوں کہ دینی علم کے سرچشمہ خود اللہ کے رسول تو یثرب میں موجود تھے۔

جواب: قول رسول کے اعتبار سے یہ جملہ زیادہ مستند نہیں ہے۔ مگر قول فطرت کے اعتبار سے وہ بالکل درست ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کا تقاضہ ہے کہ علم جہاں بھی ملے اس کو حاصل کیا جائے۔ اسی طرح فطرت کا تقاضا ہے کہ علم دین کے ساتھ علم دنیا کو بھی پوری توجہ کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے اس زمانہ میں آپ نے علم حرب سیکھنے کے لیے دو صحابی کو شام کی طرف بھیجا تھا۔

سوال: موت کا ایک دن مقرر ہے اور موت وقت سے پہلے واقع نہیں ہوتی۔ جس کی موت جیسی لکھی گئی ہے ویسی ہی ہوتی ہے۔ پھر جب کسی کی موت قتل سے ہوتی ہے تو قاتل کو سزا کیوں ہوتی

ہے جب کہ اس کی موت قتل سے لکھی گئی تھی۔ اور اگر کوئی خودکشی کر لیتا ہے اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اسے سزا کیوں ہے۔ حالاں کہ اس کی موت خودکشی سے ہی ہوئی تھی۔

جواب: اسلام میں اعمال کا دارومدار نیت (intention) پر ہے۔ قاتل کو سزا کسی کی موت پر نہیں دی جاتی بلکہ اس پر دی جاتی ہے کہ اس نے کسی کو مار ڈالنا چاہا اور اپنے شعوری ارادہ کے تحت اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اسی طرح خودکشی میں اصل جرم کسی کا مر جانا نہیں ہے بلکہ اصل جرم یہ ہے کہ ایک شخص خدا کی رحمت سے اتنا زیادہ مایوس ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر دینے کا ارادہ کیا۔ دونوں حالتوں میں شرعی حکم کا تعلق داخلی نیت پر ہے نہ کہ کسی خارجی واقعہ پر۔

سوال: پڑھائی کہاں ختم ہوتی ہے۔

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پڑھائی کہیں ختم نہیں ہوتی۔ علم کی دنیا لامحدود ہے، اس لیے علم کا سفر بھی لامحدود رہے گا۔ اسی کو ایک عربی مقولہ میں کہا گیا ہے کہ بچپن سے لے کر موت تک علم حاصل کرو (اطلبوا العلم من المهد الى اللحد)

سوال: آپ نے اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیا۔

جواب: ہندستان جیسے ملک میں عمل کا آغاز الیکشنی سیاست نہیں ہے بلکہ ذہن اور کردار کی تعمیر ہے۔ موجودہ حالت میں عملی سیاست کا کوئی فائدہ نہیں۔ انڈیا میں مہاتما گاندھی نے اور پاکستان میں محمد علی جناح نے عملی سیاست کو نقطۂ آغاز سمجھا۔ دونوں نے ہنگامہ خیز سیاست چلائی مگر مثبت نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی تحریکیں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی شخص کو دوبارہ اس غلطی کا تجربہ کرنا چاہیے۔

سوال: مولانا صاحب! آپ نے جو اتنی کامیابی پائی ہے۔ آپ پڑھائی کس طرح کیا کرتے تھے۔

جواب: پڑھائی کا کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں۔ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ پڑھنا شروع کر دیں اور ہر دوسرے تقاضے کو ثانی حیثیت دے کر بس پڑھتے ہی رہیں۔ ایک اسکالر کے الفاظ میں، پڑھنے کے تین اصول ہیں، پڑھنا، پڑھنا، پڑھنا اور آخر میں پھر پڑھنا۔

سوال: ہم نے سنا ہے کہ آپ ہمیشہ اندھیرے میں بیٹھتے ہیں، کیوں۔

جواب: میرا اصول یہ ہے کہ رات کے وقت اگر مجھ کو پڑھنا ہو تو میں اپنے کمرہ کی روشنی جلاتا ہوں اور اگر پڑھنا نہ ہو تو میں روشنی پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ غور وفکر یا عبادت کے وقت روشنی ایک قسم کے خلل (distraction) کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوال: موجودہ دور میں جو مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں اس سلسلہ میں طالب علموں کو کیا کرنا چاہیے۔

جواب: اس معاملہ میں طالب علم اور عالم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ہر ایک کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ دعا کرے اور اس کے بعد دونوں کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس معاملہ کو قرآن کی روشنی میں سمجھیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے پایا ہے کہ قرآن کے مطابق، یہ مظالم کسی غیر کا ظلم نہیں بلکہ وہ خود مسلمانوں کی اپنی نادانیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے اس معاملہ میں اصل کام اپنی نادانی کو ختم کرنا ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنا۔

۴ ستمبر کی شام کو دو اردو اخباروں کے نمائندوں نے مشترک طور پر تفصیلی انٹرویو لیا— محمد خواجہ نواب (رہنمائے دکن ڈیلی) اور محمد تقی (ورق تازہ) ان لوگوں کے سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں تیزی سے ایک تبدیلی آرہی ہے۔ اس تبدیلی کو کوئی نام دینا ہو تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جذباتی انداز فکر سے ہٹ کر تعمیری طرز فکر پیدا ہونا۔

اس تبدیلی کی ایک مثال یہ ہے کہ گنیش چترتھی کے ہندو جلوس پر مسلمان پہلے بھڑکتے تھے اور اس کے روٹ بدلنے پر اصرار کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں ہر سال فساد ہوتا تھا۔ اب چند سال سے ایسا ہو رہا ہے کہ مسلمان گنیش چترتھی کے جلوس پر نہیں بھڑکتے۔ حتیٰ کہ وہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ چنانچہ اب اس سوال پر ہندو۔ مسلم جھگڑا بھی ختم ہو گیا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (پونہ ایڈیشن) کا شمارہ ۳ ستمبر ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ ملیشیا کے انور ابراہیم کے بارے میں تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Malaysia's Anwar is a free man after six years.

انور ابراہیم سے میری ملاقات ملیشیا کے سفر (جولائی ۱۹۸۴) میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ملیشیا میں ڈپٹی پرائم منسٹر تھے۔ پھر وہ پرائم منسٹر مأثر محمد کے حریف بن گئے اور ان پر کھلی تنقید کرنے لگے۔ اس کے بعد انہیں جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل کے اندر ان پر اتنی زیادہ سختیاں ہوئیں کہ اس کے بعد وہ وہیل چیئر پر رہنے لگے۔ اب جب کہ وہ حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے تو انہیں رہا کر دیا گیا:

Anwar, broken and beaten, confined to a wheel chair and constrained by a neckbrace, probably isn't a political threat anymore to the ruling United Malay Nationalist Organisation, which has ruled Malaysia since it became independent (p. 9)

میرے نزدیک اس معاملہ میں مأثر محمد کا کیس اگر ظلم کا کیس ہے تو انور ابراہیم کا کیس نادانی کا کیس۔

اورنگ آباد کا انگریزی اخبار لوک مت ٹائمس کا شمارہ ۴ ستمبر ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ گرو گرنتھ صاحب کے بارے میں تھی۔ یہ گرنتھ ۴۰۰ سال پہلے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں ۳۰ لوگوں کے کلام ہیں جن میں ۷ مسلمان ہیں۔ سکھ عقیدہ کے مطابق، گرو گرنتھ صاحب صرف ایک گرنتھ نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک زندہ گرو کی ہے۔ سکھوں کے آخری اور دسویں گرو، گرو ارجن سنگھ نے اعلان کیا تھا کہ اب سکھوں میں کوئی گرو نہیں آئے گا۔ یہ گرنتھ ہی ان کے لیے زندہ گرو ہوگا: ان کے الفاظ یہ تھے (Guru Maneo Garanth)

ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک گرنتھ کو زندہ گرو ماننا بڑا عجیب ہے۔ مگر اس عقیدہ سے سکھ فرقہ کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے۔ اگر سکھوں میں گرنتھ کو زندہ گرو ماننے کا عقیدہ نہ ہوتا تو ان کی وحدت اور اجتماعیت مشکل ہو جاتی۔ یہاں انگریزی کی ایک ضخیم کتاب دیکھی۔ یہ باتصویر کتاب ۳۶۷ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کتاب کا نام یہ تھا:

Encyclopaedia of Modern Bodybuilding
by Arnold Schawarzenegger

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں باڈی بلڈنگ کے طریقے تفصیل کے ساتھ بتائے گئے تھے۔ موجودہ زمانہ میں باڈی بلڈنگ ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ اس پر کثیر تعداد میں چھوٹی اور

بڑی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس جدید ذہن کے نتیجہ میں یوگا کو نئی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ آج ساری دنیا میں یوگا کے سنٹر بنے ہوئے ہیں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سلام ومصافحہ کے بعد انہوں نے کہا: آپ نے مجھ کو پہچانا کہ نہیں۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہ جملہ آداب ملاقات کے خلاف ہے۔ ملنے والے کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے دوسرے کو شرمندہ ہونا پڑے۔ مثلاً آپ کے سوال پر اگر میں یہ کہوں کہ میں نے نہیں پہچانا تو یہ میرے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی شرمندگی (embarassing) کی ایک بات ہوگی۔ میرے لیے اس بنا پر کہ میں لوگوں کو یاد نہیں رکھتا۔ آپ کے لیے اس بنا پر کہ گویا آپ اتنے اہم نہیں ہیں کہ کوئی آپ کو یاد رکھے۔ آپ کو چاہیے کہ اس قسم کا جملہ سرے سے نہ بولیں یا خود ہی پوچھے جانے سے پہلے اپنا تعارف بتادیں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پرانا مثل ہے: سفر نمونۃ سقر (سفر جہنم کا نمونہ ہے) میں نے کہا کہ یہ مثل ایک غلط مفروضہ پر قائم ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کہ سفر یا تو پر راحت ہوگا یا پر مشقت۔ مگر زیادہ صحیح تقسیم یہ ہے کہ اس کو تجربہ کے اعتبار سے لیا جائے۔ سفر کو تجربہ کے معیار سے جانچا جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سفر ہر حال میں مفید ہے۔ کیوں کہ سفر میں ایسے تجربات ہوتے ہیں جو گھر پر رہ کر نہیں ہوتے۔ سفر سے اگر آپ کو سبق اور تجربہ ملے تو سفر کامیاب ہے، خواہ آپ کا سفر آرام کے ساتھ طے ہوا ہو یا تکلیف کے ساتھ۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں بہت دنوں سے الرسالہ پڑھتا رہا ہوں۔ مگر اب آپ کے الرسالہ میں سفر نامہ اور خبر نامہ بہت زیادہ آنے لگا ہے۔ اس سے میری دلچسپی کم ہوگئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی بات وہی لوگ کر سکتے ہیں جو الرسالہ کو تفریح کے لیے پڑھتے ہوں۔ الرسالہ محض ایک ماہنامہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک مشن ہے۔ سفر نامہ اور خبر نامہ مشن کی رفتار کو بتاتے ہیں۔ جو لوگ الرسالہ کو ایک مشن سمجھتے ہوں وہ سب سے پہلے سفر نامہ ہی پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح یہ مشن پھیل رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔ الرسالہ میں اگر خبر نامہ اور سفر نامہ نہ ہو تو وہ صرف عام

قسم کا ایک ماہنامہ بن جائے گا۔ مشن کے اعتبار سے اس کی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں الرسالہ کی ایجنسی چلاتا ہوں۔ پہلے میرے پاس الرسالہ کے ۵۰۰ خریدار تھے اب ان کی تعداد گھٹ کر ۱۵۰ ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ ۵۰۰ کی تعداد میں ایسے لوگ کتنے تھے جو پابندی کے ساتھ وقت پر اس کی قیمت ادا کرتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہی ڈیڑھ سو جو کہ اب باقی ہیں۔ بقیہ لوگ بہت زیادہ دوڑاتے تھے اور مشکل سے اس کی قیمت ادا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ پھر حقیقی خریدار یہی ڈیڑھ سو ہیں۔ باقی لوگ غیر سنجیدہ تھے۔ پھر اس میں تعجب کی کیا بات۔

دو انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری باتوں کا غیر سنجیدہ انداز میں جواب دے رہے تھے۔ وہ بار بار موضوع سے ہٹ کر بولنے لگتے تھے۔ یہ بات اردو میں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ میں نے بتایا کہ آرٹ آف تھنکنگ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دونوں کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ وہ انگریزی اخبار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں: بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے۔ یہ ذہن آج تک موجود ہے۔ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتے ہیں کہ باوزن بات وہ ہے جو انگریزی زبان میں کہی جائے۔

ایک اجتماع میں ہندو اور مسلم دونوں شریک تھے۔ یہاں مجھے مسلمانوں کی فیملی لائف کے بارے میں آدھ گھنٹہ بولنا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک بزرگ عالم نے تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کچھ حدیثیں سنائیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ تھی: تزوّجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم (مشکوٰۃ المصابیح، رقم الحدیث ۳۰۹۱)

یہ حدیث اکثر خطبات میں سنائی جاتی ہے۔ مگر درایت کے نقطۂ نظر سے مجھے اس حدیث میں کلام ہے۔ ایک یہ کہ کسی خاتون کے بارے میں پیشگی طور پر یہ جاننا ممکن نہیں کہ وہ زیادہ بچہ پیدا کرنے والی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ کوئی واقعی اصول ہو تو خود پیغمبر نے نعوذ باللہ اپنے مقرر کئے ہوئے اصول کے خلاف عمل فرمایا۔ کیوں کہ خدیجہ کے سوا آپ کی تمام بیویاں بشمول عائشہ بے اولاد تھیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں پہلے الرسالہ پڑھتا تھا۔ اس سے مجھے بہت فائدہ تھا۔ اس سے

میرے گھر کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ میرے بزنس میں ترقی ہوئی۔ مگر اب میں الرسالہ نہیں پڑھ رہا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ کاروبار بڑھنے کے بعد میری مصروفیت بڑھ گئی اور اب پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ میں نے کہا کہ جب آپ کو الرسالہ سے فائدہ ہوا اور اس کے ذریعہ آپ کے معاملات درست ہوئے تو اب آپ کو اس کے شکرانے کے طور پر یہ کرنا چاہیے کہ دوسرے بہت سے لوگ جن کے کام بے اصولی اور بے شعوری کی وجہ سے بگڑے ہوئے ہیں ان کے نام الرسالہ جاری کروائیں۔ یہ تو ایک غیر انسانی بات ہے کہ آپ اس کو مفید سمجھنے کے باوجود نہ خود پڑھیں اور نہ دوسروں کو پڑھوائیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ایک غیر مسلم ہیں جو اسلام کی بہت تعریف کرتے ہیں اور اپنے کو مسلمان بتاتے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنا نام نہیں بدلا۔ ایسے لوگوں کا انجام آخرت میں کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ آپ کو نام نہ بدلنے والوں کی فکر ہے مگر جو لوگ مسلمان جیسا نام رکھے ہوئے ہیں مجھے تو ان کا معاملہ زیادہ مشتبہ نظر آتا ہے۔ کیوں کہ جس نے نام نہیں بدلا وہ کم از کم منافق نہیں۔ لیکن جو لوگ مسلم نام رکھ کر اسلام کے خلاف عمل کرتے ہیں ان کا کیس تو منافقت کا کیس ہے۔ اور قرآن میں آیا ہے کہ ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار (النساء، ۱۴۵)

۵ ستمبر کی شام کو ناندیڑ سے نلنگا کے لیے بذریعہ کار روانگی ہوئی۔ یہ ضلع لاتور کا ایک ٹاؤن ہے۔ میرے نواسے صہیب چاؤش کی یہاں شادی تھی۔ اس سلسلہ میں نلنگا جانا پڑا۔ راستہ میں پہلا تجربہ یہ ہوا کہ سڑک کے دونوں طرف ہری بھری دنیا تھی۔ مگر اس کے درمیان جو سڑک تھی وہ کافی خراب تھی۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر تین گھنٹہ میں طے ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف ہرا بھرا ماحول بتا رہا تھا کہ خدا نے ہندستان کو اپنی نعمتوں سے نوازنے میں کمی نہیں کی۔ مگر سڑک کے ہچکولے بتاتے تھے کہ انسانی کرپشن نے اس خوبصورت دنیا کو صرف بدصورت بنانے کا کام کیا ہے۔

ہماری گاڑی کے ڈرائیور کا نام دیوانند مُندے تھا۔ اس نے کئی دلچسپ باتیں بتائیں۔ اس نے کہا کہ ایک بار ایک لیڈر ان کی گاڑی پر سفر کر رہے تھے۔ جب کبھی کوئی گڑھا آتا اور گاڑی کو جھٹکا لگتا تو وہ کہتے: سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

ڈرائیور نے بتایا کہ ایک بار ایک لیڈر ابو عاصم اعظمی میری گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں ٹول برج کی چوکی آئی۔ یہاں اسمبلی کے ممبروں کو ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ لیکن چوکی والوں نے نہیں مانا۔ ڈرائیور نے کہا کہ اس پر ابو عاصم اعظمی سفر کر رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم نہیں جانتے، ابو عاصم اعظمی کون ہیں۔ اس پر ابو عاصم اعظمی باہر آئے۔ انہوں نے چوکی والوں سے کہا کہ کیا تم بال ٹھاکرے کو جانتے ہو۔ چوکی والوں نے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے کہا کہ میں بال ٹھاکرے کا باپ ہوں۔ اس پر چوکی والے گھبرا گئے اور کہا کہ جاؤ، جاؤ۔

راستہ میں ڈرائیور نے چائے پینے کے لیے ایک جگہ گاڑی روکی۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی دکان تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا— گولڈن ڈھابہ۔ میں نے کہا کہ جب لکھنا ہی تھا تو فائیو اسٹار ڈھابہ لکھ دیا ہوتا۔ یہ نام ایک علامت تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل لوگ بڑے بڑے نام رکھنا چاہتے ہیں، پر بڑے بڑے کام کرنے کا شوق ان کے اندر نہیں۔

تقریباً تین گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم لوگ نلنگا ٹاؤن پہنچے۔ یہاں میرے قیام کا انتظام گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ یہ ایک ہری بھری دنیا میں بنایا گیا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ ملاقات کے لیے اکٹھا ہو گئے۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس کے لان پر بیٹھ گئے اور وہاں دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران ایک بات میں نے یہ کہی کہ نلنگا (ضلع لاتور) کا ایک حصہ ہے۔ یہ ضلع پہلے نظام اسٹیٹ میں شامل تھا۔ قاسم رضوی کا تعلق اسی علاقہ سے تھا۔ لاتور میں غالباً ابھی بھی ان کا مکان موجود ہے۔ قاسم رضوی نے یہ تحریک چلائی کہ حیدرآباد اسٹیٹ انڈین یونین میں شامل نہ ہو بلکہ اس کو ایک آزاد مسلم اسٹیٹ کی حیثیت دی جائے۔

یہ کوئی نظریہ نہ تھا بلکہ وہ ایک سیاسی رومانیت تھی جو عملاً ممکن ہی نہ تھی۔ مگر حیدرآباد کے تقریباً تمام مسلمان قاسم رضوی کے حامی بن گئے۔ اور جب آزاد حیدرآباد نہ بن سکا تو سارے مسلمانوں نے اس کی ذمہ داری سابق ہوم منسٹر سردار پٹیل پر ڈال دی۔ میرے علم کے مطابق، اس وقت مسلمانوں میں سے کوئی بھی شخص نہ اٹھا جو یہ کہے کہ آزاد حیدرآباد کا نہ بننا دراصل مسلمانوں کے سیاسی غبارہ کا ٹوٹنا تھا۔

اس کے لیے یہی مقدر تھا کہ وہ ایک دن ٹوٹ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ احتساب خویش کا معاملہ ہے نہ کہ احتجاج غیر کا معاملہ۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت زیادہ تکرار ہوتی ہے۔ آپ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی قسم کے ایک قاری سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الرسالہ میں تکرار کی شکایت کی۔ میں نے مثال پوچھی تو وہ کوئی مثال نہ دے سکے۔ پھر میں نے الرسالہ کے ایک سال کے شمارے ان کے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ آپ بتایئے کہ اس میں کون سی بات تکرار والی ہے۔ وہ تکرار کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے۔

اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر اعتراف کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اس قسم کا شوشہ نکالتے ہیں۔ مثلاً الرسالہ ۱۹۷۶ سے ایک ہی شخص کی تحریروں کے ذریعہ نکل رہا ہے۔ یہ صحافت کی تاریخ میں ایک استثنائی مثال ہے۔ اب جو لوگ اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے وہ بطور خود اپنے ذہن میں ایک مفروضہ قائم کر لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ صاحب الرسالہ کے پاس چند باتیں ہیں اسی کو وہ بار بار دہراتے ہیں۔ وہ اپنے خیالی مفروضہ کو ایک واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ ہمیشہ پائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کے بارے میں بھی اس قسم کی بات کہنے والے قدیم عرب میں موجود تھے۔ میں نے کہا کہ جب بھی کوئی شخص تنقیدی بات کہے تو آپ فوراً اس سے مثال پوچھیں۔ اگر وہ اپنے دعویٰ کی کوئی مثال پیش کرے تو اس کے دعویٰ کو درست سمجھیں اور اگر وہ اپنے دعویٰ کے حق میں کوئی مثال پیش نہ کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مریضانہ ذہنیت کا شکار ہے۔ وہ دلیل اور مفروضہ کے فرق کو نہیں سمجھتا۔

نلنگا میں میرے نواسے عبد السمیع چاؤش (صہیب) کی شادی ڈاکٹر خورشید صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ نکاح کی تقریب میں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے جس میں کئی ہندو بھی شامل تھے۔ مہاراشٹر کے سابق چیف منسٹر بھی اس میں شرکت کے لیے بمبئی سے آئے تھے۔ اس موقع پر مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی جس میں بتایا کہ اسلام کے مطابق، کامیاب زندگی کا فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اجتماعی زندگی میں، خواہ وہ فیملی کے اندر ہو یا فیملی کے

باہر، ہمیشہ لوگوں کے اندر اختلافات (differences) پیش آتے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے بلکہ اختلاف کو مینیج (manage) کرنا ہے۔ اس مسئلہ کا فارمولہ ایک لفظ میں یہ ہے:

Art of difference management.

۵ ستمبر کی شام کو نلنگا سے ناندیڑ کے لیے واپسی ہوئی۔ راستہ میں بارش کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے سوچا کہ بارش کا نظام بھی کیسا عجیب ہے۔ خدا نے پانی کی بہت بڑی مقدار بنائی اور اس کو سمندروں میں ذخیرہ کر دیا جو کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سمندر کے اس پانی کو فطری طور پر کھاری بنا دیا۔ یہ کھاری پن پانی کو خراب ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ انسان اس کھاری پانی کو کیسے استعمال کرے۔ خدا نے اس مقصد کے لیے پانی کو ہلکا اور نمک کو بھاری بنا دیا۔ چنانچہ جب سمندر کے اوپر سورج کی گرمی پڑتی ہے تو اس گرمی سے پانی بھاپ بن کر اوپر اٹھتا ہے اور اس کا نمک کا حصہ بھاری ہونے کی وجہ سے نیچے رہ جاتا ہے۔ یہ پانی اوپر جا کر بادل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور مختلف اسباب کے تحت دوبارہ بارش بن کر زمین پر برستا ہے۔ اس فطری نظام کے تحت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کھاری پانی کے بجائے میٹھا پانی انسان کو اپنے استعمال کے لیے ملے۔ شام کو ہم لوگ واپس ہو کر مغرب بعد ناندیڑ پہنچے۔ شام کو یہاں اس وقت کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں نے کچھ دیر سفرنامہ لکھوایا اور اس کے بعد عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر سو گیا۔

۶ ستمبر کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد دوبارہ حسب معمول ملاقات وغیرہ کا پروگرام جاری رہا۔ صبح کے ۱۱ بجے تک میں اپنی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں اخبارات دیکھے اور سفرنامہ مرتب کیا۔

۶ ستمبر کو ۱۱ بجے عبد القیوم صاحب کی رہائش گاہ پر جانا تھا۔ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر کئی لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ ان لوگوں سے دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ میں نے حاضرین کو آداب زندگی سے متعلق کئی حدیثیں سنائیں۔ انہوں نے ان حدیثوں کو بہت پسند کیا۔

ایک بات میں نے یہ کہی کہ کامیاب زندگی کے لیے لچک بہت ضروری ہے۔ اس معاملہ میں امریکا کے صغیر اسلم صاحب کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ان سے جب کسی کے ساتھ اختلافی معاملہ پیش

آتا ہے تو وہ اس کو زیادہ بڑھنے نہیں دیتے۔ یہ کہہ کر وہ اس کو ختم کر دیتے ہیں کہ: چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر بنسراج اور دوسرے لوگوں نے اس فارمولے کو بہت پسند کیا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ اکثر دعوہ ورک کا ذکر کرتے ہیں۔ دعوہ ورک کیا ہے۔ میں نے کہا کہ دعوہ ورک دراصل یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) سے آگاہ کیا جائے۔ خدا نے ایک معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ اس کے بعد خدا نے موجودہ زمین پر انسان کو آباد کیا۔ خدا کے نقشہ کے مطابق، زمین ایک مقام امتحان (testing ground) ہے۔ یہاں کی پوری زندگی یہی امتحان ہے۔ امیری اور غریبی، مشکل اور آسانی سب امتحان کے پرچے ہیں۔ اس امتحان میں جو لوگ کوالیفائی کریں ان کو موت کے بعد جنت میں رہنے کا سرٹیفکٹ دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی گزاریں گے۔ خدا کے اس تخلیقی منصوبہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کا نام دعوت ہے۔ دعوہ ورک کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں۔

ظہر کی نماز عبد القیوم صاحب کی مسجد میں پڑھی۔ یہ ایک خوبصورت مسجد ہے جو عبد القیوم صاحب نے اپنے گھر کے پاس بنائی ہے۔ میں نے کہا کہ جس طرح مسلمانوں کے اندر مسجد کی صورت میں عبادت کا ایک نظام قائم ہے اسی طرح دعوت کا بھی ایک باضابطہ نظام ہونا چاہیے۔ دعوت کا کام اسی طرح منظم انداز میں کرنے کی ضرورت ہے جس طرح عبادت کو منظم انداز میں ادا کیا جاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسپتال بنانا، تعلیمی ادارے بنانا، سماجی فلاح کے کام کرنا، اور اسی طرح کے دوسرے کام دنیوی معنی میں انسان کی خدمت ہیں۔ وہ انسان کی جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ مگر اس قسم کے تمام کام صرف سکنڈری حیثیت رکھتے ہیں۔ زیادہ بڑا کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شعوری بیداری (intellectual awakening) لائی جائے۔ لوگوں کے اندر روحانی ترقی (spiritual development) پیدا کیا جائے۔ انسان کی اندرونی شخصیت (inner personality) کو ربانی شخصیت بنایا جائے۔ یہی وہ عمل ہے جو موت کے بعد کی دنیا میں کام آئے گا۔ بقیہ تمام کام دنیوی کام ہیں۔ وہ اسی دنیا میں رہ جانے والے ہیں۔

ایک صاحب نے میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج بنانے کی بات کی۔ میں نے کہا کہ یہ کام کا سرسید ماڈل ہے جو بدقسمتی سے آج تک مسلمانوں کے ذہن پر حاوی ہے۔ سرسید ماڈل یہ تھا کہ مسلمانوں کی یونیورسٹی بنائی جائے مگر اس ماڈل میں اچھی اسکولنگ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا گنبد تو بن گیا مگر اس کا فائدہ مسلمانوں کو بہت کم ملا۔ کیوں کہ مسلم طلبہ اسکولنگ میں کمزور ہونے کی وجہ سے اگلے ٹسٹ میں پورے نہ اتر سکے۔ اس کے مقابلہ میں کرشچین ماڈل زیادہ صحیح ہے۔ ان لوگوں نے اسکولنگ کی اہمیت کو سمجھا۔ سارے انڈیا میں انہوں نے بہترین اسکول کھول دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسکولوں میں پڑھے ہوئے طلبہ کالج اور یونیورسٹی میں چھا گئے۔

ناندیڑ کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک اندازہ یہ ہوا کہ یہاں کے لوگ سادہ مزاج کے لوگ ہیں۔ وہ اختلافی بات پر زیادہ بحث نہیں کرتے۔ وہ نہایت آسانی سے اپنی رائے کے خلاف بات کو مان لیتے ہیں۔ یہاں کے لوگ گویا کہ ''چلو یہ بھی ٹھیک ہے'' کے مزاج پر ڈھلے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک سوال پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل ہر آدمی کی زندگی کا مرکز ومحور صرف ایک ہے، اور وہ ہے پیسہ کمانا۔ اور وہ پیسہ بھی کس کے لیے، صرف اپنی اولاد کے لیے۔ گویا کہ ہر آدمی اپنی اولاد کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی خود تو محنت ومشقت سے پیسہ کماتا ہے مگر اپنی اولاد کے لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی محنت کے بغیر اس کو سب کچھ مل جائے۔ میں نے کہا کہ یہ اولاد کے ساتھ دشمنی ہے۔ بلا محنت کا پیسہ (easy money) آدمی کو بگاڑتا ہے۔ محنت کی روزی سب سے اچھی روزی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کو محنت کی وراثت دیں نہ کہ آرام وراحت کی وراثت۔

۶ ستمبر کی شام کو ڈاکٹر ہنسراج ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ تقریباً ۱۵ آدمی تھے، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ان لوگوں سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ نفرت ہے۔ یہ بہت پہلے سے چلی آرہی ہے۔ مہاتما گاندھی کی تحریک انگریزوں سے نفرت کی بنیاد پر اٹھی اور محمد علی جناح کی تحریک ہندوؤں سے نفرت کی بنیاد پر

اٹھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اسی منفی مزاج کو لے کر آزاد ہندستان میں داخل ہوئے۔ اب پہلے والا نشانہ موجود نہیں۔ لیکن مزاج وہی ہے۔ چنانچہ اب ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہندستان میں نفرت کی بنیاد بہت گہری ہے اور اس کو گہری بنیادوں پر ختم کرنا ہوگا۔ اس مجلس میں کئی جرنلسٹ موجود تھے۔ ان میں سے دو کے نام یہ ہیں: رام پرشاد کھنڈوموال اور وجے نلنگیر (دینک ہندستان)۔ ان لوگوں سے دیر تک ملکی اور قومی مسائل پر گفتگو ہوئی۔

ایک اخباری نمائندہ نے یہ سوال کیا کہ نیشنل انٹگریشن کی فیلڈ میں آپ کافی کام کرتے رہے ہیں۔ نیشنل انٹگریشن کے لیے آپ کا فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جب بھی مختلف گروپ کسی سوسائٹی میں رہیں گے تو وہاں اختلافات (differences) آئیں گے۔ پہلے لوگوں کا فارمولا یہ تھا کہ اختلاف مٹاؤ تاکہ اتحاد قائم ہو۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غیر عملی فارمولا ہے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا ممکن ہی نہیں۔ صحیح فارمولا یہ ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ اختلافات کو مینیج (manage) کرنا جانیں۔ میں لوگوں کو وہ حکمت بتاتا ہوں جس کو میں نے یہ نام دیا ہے:

Art of difference management.

یعنی اختلاف کو برداشت کرو تاکہ اتحاد قائم ہو۔

ایک سوال بابری مسجد کے بارے میں تھا۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ کو پوری طرح کورٹ کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ اگر بالفرض موجودہ حالات میں کورٹ یہ فیصلہ دے کہ بابری مسجد کو ری لوکیٹ کر دیا جائے تو مسلمانوں کو اس پر راضی ہو جانا چاہیے۔ عرب ملکوں میں سٹی پلاننگ کے تحت سیکڑوں مسجدوں کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا ہے۔

۶ ستمبر کی شام کو اسلام پسند حلقہ کے کئی لوگ ملاقات کے لیے آ گئے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تصویر (image) ساری دنیا میں خراب ہوگئی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمان اکسٹریمسٹ، تشدد پسند اور جنگجو سمجھے جاتے ہیں۔ اس امیج کو

باقی رکھتے ہوئے کوئی بھی مثبت کام نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم ذمہ داری دعوت ہے۔ کشیدگی کے ماحول میں دعوت کا کام نہیں کیا جاسکتا۔ پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کی امیج بگاڑنے کی ذمہ داری میڈیا پر نہیں ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری خود ہمارے علماء اور رہنماؤں پر ہے۔ یہ انہی لوگوں کی غلط رہنمائی ہے جس نے یہ مسئلہ پیدا کیا۔

ثنا اسکول ناندیڑ کا ایک معیاری اسکول ہے۔ اس کی خاتون پرنسپل مسز معراج النساء نے ایک واقعہ بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے اسکول کی ایک خاتون ٹیچر، امت المتین نے بتایا کہ ان کی والدہ ریگولر طریقہ سے اپنے بیٹے کو الرسالہ پڑھواتی تھیں۔ ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ الرسالہ انسان کو اعتدال پسند بناتا ہے۔ اور اعتدال پسندی اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

پرنسپل معراج النساء نے اپنے بارے میں کہا کہ میں الرسالہ برابر پڑھتی ہوں۔ اس کو پڑھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ برائی کوئی ابدی چیز نہیں، برائی کو اچھائی سے بدلا جاسکتا ہے۔ الرسالہ کے بارے میں اس قسم کے تاثرات کئی لوگوں نے بتائے۔ میں نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ ایک طرف کچھ لوگ الرسالہ کو برا بھلا کہتے ہیں، حتی کہ بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ الرسالہ مسلم دشمنوں کا آلۂ کار ہے۔ آخر یہ دو متضاد رائیں کیوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی قسم کی رائے ان لوگوں کی ہے جو الرسالہ کے بارے میں رائے بنانے کے لیے خود الرسالہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ براہ راست الرسالہ کو پڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے بناتے ہیں۔ دوسری رائے ان لوگوں کی ہے جو سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر رائے قائم کر لیتے ہیں۔ جو اخباری رپورٹوں کو پڑھتے ہیں اور اس کو الرسالہ کی بات سمجھ لیتے ہیں۔ رائے قائم کرنے کا یہ دوسرا انداز انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس معاملہ میں کسی آدمی کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ خود الرسالہ کے مضامین سے اپنی رائے بنائے یا وہ اس بارے میں بالکل خاموش رہے۔

کچھ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سوال کیا کہ آج کل جہاد کے نام پر جو تشدد جگہ جگہ ہو رہا ہے اس کا خاتمہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اصل یہ

ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے اسلام کا یہ تصور دیا کہ اسلام سیاسی اقتدار چاہتا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ یہاں تک کہ ضرورت ہو تو وہ جنگ تک جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے نظریات جو موجودہ زمانہ میں چلائے گئے اسی کا براہ راست نتیجہ موجودہ تشدد کلچر ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یا تو ہمیں اسلامی اقتدار قائم کرنا ہے، یا اسی راہ میں لڑ کر مر جانا ہے۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے مذکورہ قسم کا سیاسی نظریہ پیش کیا انہیں اور ان کے پیروؤں کو یہ اعلان کرنا پڑے گا کہ ہم نے اسلام کی جو سیاسی تشریح کی وہ غلط تھی۔

پھر میں نے کہا کہ یہ مسلمان آج کل ایک تضاد میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے عقیدہ کے تقاضے کے تحت گولی اور بم کا کلچر چلاتے ہیں۔ اور جب فریق ثانی زیادہ بڑی طاقت کے ساتھ ان کو اپنی جوابی کارروائی کا نشانہ بناتا ہے تو وہ ہیومن رائٹس کا حوالہ دے کر احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ اگر ان کا نظریہ درست ہے تو جو کچھ ان کے ساتھ پیش آ رہا ہے وہ ان کے اپنے نظریہ کی قیمت ہے۔ پھر انہیں اس قیمت کو خوشی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے نہ کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔

۶ ستمبر کی شام کو کلامندر کے ہال میں پروگرام تھا۔ یہاں کافی لوگ آئے۔ یہاں تقریر کا موضوع یہ تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام۔ یہ جلسہ مولانا مفتی سید تمیز الدین صاحب قاسمی کی صدارت میں ہوا۔ اس کے علاوہ اسٹیج پر ناندیڑ کے حسب ذیل افراد بیٹھے ہوئے تھے: ڈاکٹر ہنس راج وید یہ صاحب، پروفیسر مورے، مسٹر کشن پٹیل۔ میں نے اپنی تقریر میں قرآن وحدیث کے حوالے سے بتایا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، تمام انسان ایک خدا کی عیال ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن کو بھی حسن سلوک سے اپنا دوست بناؤ۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سماج میں تم نفع بخش بن کر رہو یا کم از کم یہ کرو کہ تم دوسروں کے لیے بے ضرر بن جاؤ۔

۷ ستمبر کی شام کو مہاتما پھلے ہال میں پروگرام تھا۔ یہ پروگرام ساڑھے سات بجے ختم ہوا۔ اس کے بعد میں واپس اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ میں اوپر کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے پیغام آیا کہ ایک اسٹوڈنٹ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی تو میں مصروف ہوں، میں فوراً نہیں مل سکتا۔

کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نوجوان خواتین سے اصرار کرنے لگا کہ مجھے مولانا سے ملنا ہے۔ میرا اپائنٹمنٹ طے ہو چکا ہے۔ خواتین کو شک ہوا اور انہوں نے اس کو لوٹانا چاہا مگر وہ لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں ایک منٹ کے لیے اوپر جاؤں گا۔ اتنے میں مسٹر عبد الرحمٰن آ گئے۔ ان کو دیکھ کر وہ اسٹوڈنٹ کچھ نرم پڑا۔ عبد الرحمٰن صاحب نے پوچھا کہ تم ایک منٹ کے لیے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ چنانچہ عبد الرحمٰن صاحب نے اس کو لوٹا دیا۔

ناندیڑ میں ایک ہندو پروفیسر نے اپنی ایک کتاب بطور تحفہ دی۔ اس کتاب کا نام یہ تھا:

Islam: Maker of the Muslim Mind by Prof. Sheshrao More

اس کتاب میں عمومی طور پر اسلام کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ مگر اس میں بعض خطرناک غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر چہ یہ غلطیاں وہی ہیں جو خود مسلم مصنفین کے یہاں موجود ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ مسلمان آج کل مختلف مقامات پر اپنے مادی حقوق کے لیے جو متشددانہ لڑائی لڑ رہے ہیں، وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اسلام ان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم ناانصافی کو برداشت نہ کرو:

Since Islam teaches its votaries not to tolerate injustice and persecution, the religion was naturally perceived as the inspiration for the community's hostile attitude. (p. 1)

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ حدیث میں مومن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: مفتاح للخیر مغلاق للشر (خیر کا دروازہ کھولنے والا اور شر کا دروازہ بند کرنے والا)۔ اس قسم کی تعلیم جو اسلام میں دی گئی ہے وہ انسانیت عامہ کے تعلق سے ہے، نہ کہ ذاتی مفادات کے تعلق سے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانیت عامہ کے معاملہ میں مومن کو حساس ہونا چاہیے۔ مگر جہاں تک ذاتی نقصان کا تعلق ہے، اس میں اہل ایمان کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

آج کل مسلمان مختلف مقامات پر جو متشددانہ جہاد کر رہے ہیں وہ انسانیت عامہ کے مفاد کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے مادی حقوق کے لیے ہے۔ اور اسلام میں جس جہاد کی تعلیم دی گئی ہے وہ

جہاد فی سبیل اللہ ہے، وہ ملک و مال کی ذاتی لڑائی کے لیے نہیں۔ موجودہ قسم کی لڑائی قومی لڑائی ہے، وہ ہرگز اسلامی جہاد نہیں۔

ناندیڑ میں ایک مسلم تنظیم قائم ہے۔ اس کا نام یہ ہے: ثنا ویلفیر اینڈ ایجوکیشن سوسائٹی۔ اس سوسائٹی کے تحت ثنا ہائی اسکول اور جونیر کالج قائم ہے۔ دونوں کامیابی کے ساتھ اعلیٰ معیار پر چلائے جارہے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اُنہوں نے اردو کے ساتھ انگریزی وغیرہ علوم کو شامل کیا ہے۔ یہاں کے پڑھے ہوئے طلباء ہر سال اچھے نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوتے ہیں۔ ۲۰۰۴ میں پرائمری بورڈ کے امتحان میں جماعت چہارم کی طالبہ فاطمہ محمد یوسف نے ضلع میں پہلا مقام حاصل کیا۔ اس ادارہ کی پرنسپل معراج النساء صاحبہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس ادارہ کی ترقی کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔

۷ ستمبر ۲۰۰۴ کو اس ادارہ نے میرے خطاب کا پروگرام رکھا تھا۔ ایک بڑے ہال میں تمام طلباء اور اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ یہاں میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جدید علوم اسلام کے دشمن نہیں ہیں بلکہ وہ اسلام کے معاون ہیں۔ قدیم علوم اور جدید علوم میں یہ فرق ہے کہ قدیم علوم قیاسات اور مفروضات پر مبنی تھے۔ اس لیے یہ ممکن تھا کہ اُن میں اسلام دشمن باتیں شامل ہو جائیں۔ مگر جدید علوم کا معاملہ اُن سے مختلف ہے۔ جدید علوم، دوسرے لفظوں میں، علوم فطرت ہیں۔ یعنی خدا کی تخلیقات میں چھپے ہوئے قوانین کو دریافت کرنا اور اُن کی بنیاد پر علوم کی تشکیل و تدوین کرنا۔

ایسی حالت میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ جدید علوم اسلام دشمن علوم بن جائیں۔ اسلام اور ان علوم کے درمیان وہی نسبت ہے جو خالق اور تخلیق کے درمیان ہے۔ ظاہر ہے کہ خالق اور تخلیق کے درمیان تضاد ممکن نہیں۔ اسی طرح اسلام اور جدید سائنسی علوم کے درمیان تضاد نہیں ہوسکتا۔

آج کل مدارس میں عصری علوم کے نام سے شعبے کھولے جارہے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں لوگوں کے درمیان ایک غلط فہمی ہے۔ وہ کمپیوٹر جیسی کچھ چیزوں کے لیے کلاس کھولتے ہیں اور اس کو عصری علوم سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ عصری میتھڈ ہے، نہ کہ عصری علم۔ عصری طریقوں کو مدارس میں ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔ لیکن کچھ عصری طریقوں کو مدارس میں رائج کر کے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عصری

علوم کو مدارس کے تعلیمی نظام میں شامل کرلیا گیا۔

تقریر کے بعد لوگوں کی طرف سے سوالات آنے لگے۔ یہاں تک کہ سوالات کی بھرمار ہوگئی۔ تقریباً سو کے قریب لکھے ہوئے سوالات آئے۔ ناظم جلسہ نے منتخب سوالات پڑھ کر سنائے اور میں نے ان کا جواب دیا۔ عجیب بات ہے کہ ان میں سے شاید کوئی سوال بھی منفی انداز کا نہ تھا۔ تقریباً تمام سوالات مثبت انداز کے تھے۔ اُن میں سے کچھ سوال اور اُن کے جواب یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

سوال: مدنی دور اور مکی دور کا نمایاں فرق کیا ہے۔

جواب: اصل یہ ہے کہ قرآن کا نزول حالات کے اعتبار سے ہوا۔ مکی حالات کے لحاظ سے مکی سورتیں نازل ہوئیں اور مدنی حالات کے لحاظ سے مدنی سورتیں نازل ہوئیں۔ اگر آپ دونوں قسم کی سورتوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں دوروں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے دعوت اور تعمیر ذہن کی پرامن جدوجہد۔ مدنی دور میں بنیادی طور پر دو چیزوں کا اضافہ ہوا۔ ایک ہے مسلم معاشرہ کی باقاعدہ تنظیم، اور دوسری چیز ہے جارحانہ حملوں کے مقابلہ میں دفاعی کوشش۔ یہ دفاعی کوشش زیادہ تر اعراض کی صورت میں ہوئی۔ البتہ چند بار مسلح ٹکراؤ کی صورت بھی پیش آ گئی۔

سوال: مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اسباب اور حل پر مختصر اً روشنی ڈالیے۔

جواب: میرے نزدیک اس پس ماندگی کی تمام تر ذمہ داری مسلم رہنماؤں کے اوپر ہے۔ یہ لوگ موجودہ حالات کے مقابلہ میں منفی ردعمل کا شکار ہوگئے۔ وہ مسلمانوں کے اندر مسلسل طور پر شکایت اور احتجاج کا مزاج پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسائل کے خلاف ابھارا مگر انہوں نے مسلمانوں کو مواقع (opportunities) کی نشاندہی نہ کی۔ حتی کہ انہوں نے جدید تعلیم کو مغربی قوموں کی سازش کا نام دے دیا۔ اسی منفی ذہن سازی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمان تعلیم کے میدان میں پوری توجہ کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے۔

سوال: حدیث کا مفہوم ہے کہ ظالم اور مظلوم کی مدد کی جائے۔ صحابہ نے پوچھا، مظلوم کی مدد تو سمجھ میں

آتی ہے۔ظالم کی مدد کے کیا معنٰی۔حضور نے کہا، اس کو ظلم سے روکو۔وضاحت کیجئے۔

جواب: ''ظلم سے روکو'' کا مطلب ہے کہ اس کو ظلم سے رکنے کی نصیحت کرو۔اس کے لیے تنہائیوں میں دعا کرو۔اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کر کے اس کے دل کو بدلنے کی کوشش کرو۔حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ظالم کے خلاف احتجاج کی مہم چلاؤ۔اس کے خلاف تشدد کی کارروائی کرو۔

سوال: اسلام میں ردعمل یا بدلہ کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔

جواب: اگر کوئی شخص آپ کے خلاف برائی کرے تو آپ منھ سے بول کر الفاظ کی صورت میں اس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں مگر انتقام یا عملی کارروائی کا حق کسی فرد کو نہیں۔اس کا حق صرف عدالت کو ہے۔باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بعد ہی کسی شخص کے اوپر عملی سزا کا نفاذ کیا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ کے نظریہ کے مطابق، ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار صرف مسلمان ہیں، برائے کرم اس پر تبصرہ کیجئے۔

جواب: میرا یہ نظریہ نہیں کہ ہندستان کے مسلمان فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار ہیں۔میرا نظریہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف صرف بطور خود احتجاج کا طریقہ اختیار کیا۔انہوں نے یہ کوشش نہیں کی کہ قرآن میں اس مسئلہ کا حل تلاش کریں۔میں نے بار بار اپنی تحریروں میں بتایا ہے کہ قرآن میں اس مسئلہ کا واضح حل موجود ہے۔اور وہ حل صبر اور تقویٰ ہے (آل عمران ۱۲۰)

سوال: مسلمانوں کو موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔کیا مسلمانوں کو خود کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اگر ہے تو کیا۔

جواب: قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو صرف اپنے عمل کے بقدر نتیجہ ملتا ہے۔انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔اس پرانے اصول کے مطابق، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جو کچھ کھویا ہے وہ خود اپنے بے عملی کی بنا پر کھویا ہے۔اب وہ صرف اپنی عملی

جدوجہد کے ذریعہ ہی اپنے لیے کوئی نیا مستقبل بنا سکتے ہیں۔

سوال: کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ دنیا میں خلافت طرز حکومت ہونی چاہیے، یعنی دنیا کے مسلمانوں کا ایک امیر ہو۔ اس کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

جواب: امارت کا تعلق سیاسی حکومت سے نہیں ہے بلکہ اطاعت کی رضا کارانہ اسپرٹ سے ہے۔ مسلمان اگر امیر کی اطاعت کو اپنے اوپر فرض سمجھے تو حکومت کے بغیر ہی ان کے درمیان امارت کا نظام قائم ہو جائے گا اور اگر اطاعت کی اسپرٹ نہ ہو تو حکومت کی موجودگی میں بھی انارکی کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ جیسا کہ حضرت علی کے زمانۂ خلافت میں پیش آیا۔

سوال: آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ اسے سیکھنے کا آسان طریقہ کیا ہے۔

جواب: انگریزی زبان یا کسی بھی علم کو حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ محنت ہے۔ اسی حقیقت کو ایک عربی مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے—من جد وجد۔

سوال: معلم (ٹیچر) میں کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔

جواب: میرے نزدیک معلم کے اندر سب سے بڑی صفت جو ہونی چاہیے وہ یہ کہ وہ طالب علموں کا خیر خواہ ہو۔ اگر معلم کے اندر اپنے طالب علموں کے لیے سچی خیر خواہی ہو تو اپنے آپ وہ ایک کامیاب معلم بن جائے گا۔

سوال: انگریزوں کے خلاف علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ اگر وہ غلط تھا تو اس میں جان دینے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب: آخرت میں کس کا انجام کیا ہوگا، یہ مکمل طور پر خدا کا معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی انسان کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ البتہ جہاں تک جہاد کے فتویٰ کا تعلق ہے، خواہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ ہو یا موجودہ زمانہ میں مفروضہ دشمنوں کے خلاف فتویٰ، یہ سب کے سب شرعی اعتبار سے غلط فتوے ہیں۔ اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ جو چیز ممکن ہے وہ یہ کہ بشرط اخلاص ان فتووں کو اجتہادی خطا کا درجہ دے دیا جائے۔

سوال: قرآن اور حدیث کو سمجھنے اور سمجھانے کا طریق کار کیا ہے۔

جواب: اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ضروری علوم حاصل کرنے کے بعد قرآن وحدیث کے متن پر غور کیا جائے اور مسلسل دعا کی جاتی رہے کہ خدا علم صحیح کی توفیق دے اور ذہنی گمراہی سے بچائے۔

سوال: آپ کی نظر میں اردو کی سب سے بہترین تفسیر کون سی ہے۔

جواب: کوئی تفسیر سب سے بہتر تفسیر نہیں ہوتی۔ ہر تفسیر کسی اعتبار سے مفید ہوتی ہے۔ اسی ذہن کے ساتھ تفسیروں کو پڑھنا چاہیے۔

سوال: دینی اور دنیاوی علم کے اعتبار سے آپ ایک بہت بڑے اسکالر ہیں۔ آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ کیا کوئی ایسی دعا ہے جس کے پڑھنے کے بعد چیزیں جلدی یاد ہوں اور پھر وہ نہ بھولیں۔

جواب: دعا کچھ رٹے ہوئے الفاظ کا نام نہیں ہے۔ دعا دل کی تڑپ کا نام ہے۔ دل کی تڑپ کے ساتھ دعا ضرور پوری ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت مسیح نے ان الفاظ میں بیان کیا: مانگو تو پاؤ گے۔

سوال: سیکولر نظام تعلیم میں جو بھگوا کرن کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب: میرے نزدیک بھگوا کرن کا خطرہ ایک مفروضہ خطرہ ہے، اس سے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اصل خطرہ مغربی کرن ہے۔ مغربی کرن یا ویسٹرنائزیشن نہ صرف ہندستان کے مسلمانوں کو بلکہ ساری مسلم دنیا کے مسلمانوں کو اپنی زد میں لے چکا ہے۔ وہ ان ملکوں میں بھی داخل ہو چکا ہے جن کو خوش فہم رہنما اسلام کا قلعہ بتاتے تھے۔ یا یہ کہتے تھے کہ وہ اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے۔

۷ ستمبر کو ۱۱ بجے مدینۃ العلوم کالج میں خطاب کا پروگرام ہوا۔ اس کا موضوع تھا ''عصری تعلیم کی اہمیت''۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ عصری تعلیم کی اہمیت صرف جاب کے لیے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ علوم اسلام کے حق میں تائیدی علوم ہیں۔ ان کو اسلام کا جدید علم کلام کہا جا سکتا ہے۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ کس طرح جدید علوم اسلام کی تعلیمات کو خالص سائنسی بنیادوں پر مدلل کر رہے ہیں۔

۷ ستمبر کی دوپہر کو عبد القیوم صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ دو کام ایک دوسرے

سے بالکل الگ ہیں — دعوۃ ورک اور کمیونٹی ورک۔ کمیونٹی ورک ہر قوم میں اور ہر جگہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک دعوۃ ورک کا تعلق ہے وہ اس وقت کہیں بھی صحیح طور پر انجام نہیں پا رہا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ کمیونٹی ورک اور دعوۃ ورک میں یہ فرق ہے کہ کمیونٹی ورک کا مقصد ہوتا ہے، اپنی کمیونٹی کو بچانا، اور دعوۃ ورک کا مقصد ہوتا ہے، انسانیت کو بچانا۔

ایک پروگرام میں ایک صاحب نے ایک کاغذ پر یہ لکھ کر بھیجا:

اکثر مساجد کے امام وعلماء ہی نفرت کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ کے معصوم بندے جذبات میں آکر قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ ان امام وعلماء کے نام ایک ایک کتاب لکھئے (نعیم خاں، بمعرفت حاجی واجد علی خاں، ایچ۔ پیر برہان نگر، ناندیڑ 9422189882)

میں نے کہا کہ یہ صرف علماء اور ائمہ کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہی تمام لوگوں کا حال ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ''نفرت مٹاؤ، دیش بچاؤ'' کا نعرہ لگاتے ہیں وہ بھی عملاً یہی کر رہے ہیں۔ ان کے اخباروں اور رسالوں میں مستقل طور پر دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی باتیں چھپتی رہتی ہیں۔ وہ یہ تصور دیتے ہیں کہ دنیا ہمارے حق میں ظالم ہوگئی ہے۔ اس قسم کی باتیں گویا نفرت کا جنگل اگانے کے ہم معنیٰ ہیں۔ اور جب نفرت کا یہ جنگل اُگ آتا ہے تو اس کے بعد وہ نفرت ختم کرو کی مہم چلاتے ہیں، صرف اس لیے تاکہ وہ نفرت کی کھیتی اگانے کے جرم سے اپنے آپ کو بری الذمہ کر سکیں۔

انڈین یونین مسلم لیگ کی ناندیڑ شاخ کے کنوینر کی طرف سے ان کے لیٹر ہیڈ پر دو صفحہ کی تحریر مجھے دی گئی۔ اس تحریر کا ایک حصہ کسی تبدیلی کے بغیر بعینہٖ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

محترم المقام مولانا وحید الدین خاں صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بعد از سلام آپ کی خدمت میں بذریعہ تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرنے جا رہا ہوں، امید کہ آپ غور کریں گے۔ میں گذشتہ کئی برسوں سے آپ کا تحریر کردہ ''الرسالہ'' کا قاری ہوں۔ آپ کی تحریر کے ایک ایک لفظ میں طلسم ہے۔ آپ کا دانشورانہ انداز بیان لاجواب ہے۔ لیکن آپ کی تحریر میں منفی

انداز فکر کا تسلسل ہے۔ عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ آپ کی تحریر سے مسلم مخالف طاقتوں کو تحریک ملتی ہے اور مسلمانوں کو مایوسی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ ہے کہ ہندستان میں ہونے والے فسادات کے ذمہ دار صرف مسلمانوں کو ہی کہا جائے۔ مسلمان تو ظلم وستم کا شکار ہو کر تکلیف سے کراہ اُٹھتا ہے۔ وہ ردّعمل کبھی نہیں کرتا۔ ہندستانی مسلمان تو انتقام لینے کے قابل ہی کہاں ہے۔ انتقام و ردّعمل تو طاقت ور لوگ کرتے ہیں۔ ہندستانی مسلمان دو وقت کی روزی روٹی اور اپنے بچوں کی تعلیم میں اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ وہ دیگر مسائل کو بھول چکا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ چاروں جانب سے یلغار ہے۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی، ہر محاذ پر منظم سازش کے تحت مسلمانوں کو پیچھے کیا جارہا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں پر پاکستان، کشمیر، اور طالبان کے نام پر مسلسل ظلم وستم کیا جارہا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے اور اُس پر ستم یہ ہے کہ آپ بھی مسلسل مسلمانوں پر ہی تنقید کرتے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات آپ کی تحریر میں سنگھ پریوار کا عکس نظر آتا ہے۔ آپ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ مسلمانوں سے دور اور آر ایس ایس کے قریب نظر آتے ہیں۔

اس خط کا مختصر جواب یہ ہے کہ انڈیا کے بارے میں مذکورہ شکایتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں کے ہندوؤں نے ہندو مہا سبھا بنائی اور یہاں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ قائم کی۔ تقسیم کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کو اتنی آزادی ملی کہ ابھی تک ان کے یہاں مسلم لیگ بدستور قائم ہے اور اپنا کام کررہی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں یہ ناممکن ہے کہ وہاں کے ہندو لوگ وہاں ہندو مہا سبھا کے نام سے اپنی تنظیم قائم کریں اور اس کے نام پر الیکشن لڑیں۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پاکستان کے ہندوؤں کے مقابلہ میں ہندستان کے مسلمان سو گنا زیادہ بہتر ہیں۔ حالاں کہ مسلم لیگ کے قائد نے تقسیم سے پہلے کہا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو قربان کرکے پاکستان بنوائیں گے۔ یہی فرق اس پورے معاملہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ آدمی کے اندر سوچنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

مسٹر عبدالرحمٰن چاؤش کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز چاؤش کی عمر ۱۲ سال ہے۔ ان کا سوال یہ

تھا: اچھا مسلمان بننے کے لیے کسی شخص کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ آدمی اچھا انسان بنے۔ اچھا انسان گویا وہ زرخیز زمین ہے جس پر اچھے مسلمان کا درخت اگتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الاسلام۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی فطری صفات کے اعتبار سے اچھا انسان ہوتا ہے وہی دین اسلام کے اعتبار سے اچھا مسلمان بنتا ہے۔ جس آدمی کے اندر انسانی اوصاف نہ ہوں اس کے اندر اسلامی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اخلاقیات کی زمین پر اسلامیات کا باغ اگتا ہے۔

ایک مسلم اسکول کے پرنسپل سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں تعلیمی ادارہ قائم کرنا گویا ایک صدقۂ جاریہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک شعر میں کہا تھا:

خیر گر چاہتا ہے خیر کے اسباب بنا　　پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

صدقۂ جاریہ کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر ایک کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں تعلیمی ادارہ قائم کرنا صدقۂ جاریہ کا ایک اہم شعبہ ہے۔ بلکہ شاید وہ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ اہم شعبہ ہے۔ کیوں کہ تعلیم کے ذریعہ آدمی سوچنے سمجھنے کے قابل بنتا ہے، اور بلاشبہہ اس دنیا میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سوچنے کے قابل ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو تعمیر شعور کہا جاتا ہے۔

۸ ستمبر کو پربھنی میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اس خطاب کا انتظام یہاں کی مسجد میں کیا گیا تھا۔ مولانا جہانگیر صاحب نے اس کو کنڈکٹ کیا۔ مولانا جہانگیر صاحب ایک سنجیدہ عالم ہیں۔ انہوں نے پروگرام کو نہایت خوبی کے ساتھ چلایا۔ میرے اس خطاب کا موضوع تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام۔ اس موضوع پر میں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک مفصل تقریر کی۔

اس جلسہ میں کچھ مقامی ہندو بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر موہن مولگے (Dr. Mohan Mawlage) تھے۔ وہ پربھنی کے مشہور ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ وہ تقریر سے کافی متاثر ہوئے اور اس کے بعد وہ اصرار کر کے مجھے اپنے اسپتال لے گئے۔ یہاں ہمارے تمام ساتھی بھی موجود

تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی باتیں ہمیں بہت پسند آئیں۔ اب ہم زیادہ بڑے پیمانہ پر پربھنی میں آپ کا پروگرام کرنا چاہتے ہیں۔

۸ ستمبر کو پربھنی کی ایک مجلس میں میرے سامنے عبداللہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جیب میں رکھے ہوئے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ موبائیل پر کسی سے بات کرنے لگے۔ جب ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے ان کا موبائل اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ موبائل آپ کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ یہ موبائل ایک علامت ہے جو بتاتا ہے کہ آپ مسلم بادشاہوں اور مسلم نوابوں سے بھی زیادہ اچھی حالت میں ہیں۔ کیوں کہ ماضی کے وہ لوگ جن کو مسلم بادشاہ اور مسلم نواب کہا جاتا ہے ان میں سے کسی کے پاس بھی موبائیل ٹیلی فون نہ تھا۔ اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں جو آج عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ جب کہ پچھلے زمانہ میں وہ حکمرانوں کو بھی حاصل نہیں تھیں۔ ایسی حالت میں آپ کو چاہیے کہ آپ ہر وقت خدا کا شکر ادا کریں۔ آپ کی زبان سے کبھی ناشکری کا کلمہ نہ نکلے۔ پھر میں نے کہا کہ کم از کم اپنے تجربہ میں میں نے دیکھا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر مسلمان شکایتی بولی بولتا ہے، کوئی بھی مسلمان حقیقی معنوں میں شکر ادا کرنے والا نہیں۔

۸ ستمبر کی دوپہر کا کھانا پربھنی میں محمد مشتاق احمد، ڈپٹی انجینئر کے گھر پر کھایا۔ یہاں کھانے پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہاں میں نے کئی موضوع پر سوالات کی وضاحت کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر صبر کب تک۔ بابری مسجد توڑی گئی اس پر ہم نے صبر کیا، مسجد میں بم پھٹا اس پر ہم نے صبر کیا۔ پھر صبر کا یہ سلسلہ کب تک رہے گا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ صبر کرتے تو آپ مجھ سے یہ سوال ہی نہ کرتے۔ انہوں نے کہا کہ ''بس جواب مل گیا''۔

محمد مشتاق احمد صاحب نے جلد ہی ایک نرسری اسکول کھولا ہے۔ فی الحال وہ اپنے وسیع گھر کے ایک حصہ میں اس کو چلا رہے ہیں۔ ایک خاتون اس کی پرنسپل ہیں۔ میں نے اس کو دیکھا۔ میں نے کہا کہ اچھی تعلیم کے لیے اچھی اسکولنگ بہت ضروری ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اچھی اسکولنگ کا تصور مسلمانوں میں بہت دیر میں آیا ہے۔ جب کہ دوسروں میں وہ بہت پہلے آچکا تھا۔ اچھی اسکولنگ نہ ہونا

ہی مسلمانوں کی تعلیمی پچھڑے پن کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اب اس کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس علاقہ کے اخبارات میں برابر میرے خطابات اور پروگراموں کی رپورٹنگ آتی رہی۔ یہاں ان کی تفصیل دینا ممکن نہیں۔ اورنگ آباد سے چھپنے والا مراہٹی اخبار دینک لوک مت کے شمارہ ۷ ستمبر ۲۰۰۴ میں میری ایک تقریر کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اخبار نے اس کا جو عنوان قائم کیا اس کا ترجمہ یہ ہے:

اسلام میں غیر حکومتی گروپ کو ہتھیار اٹھانے کا حق نہیں

میں نے مراہٹی جاننے والے ایک صاحب سے اس رپورٹ کو پڑھوا کر سمجھا۔ یہ تقریباً صحیح رپورٹ تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا وہی اخبار والے نے شائع کیا تھا۔ جب کہ اردو اخبارات کے بارے میں میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ اردو اخبار والوں کا حال یہ ہے کہ میں کچھ کہتا ہوں اور اردو اخبارات اس کو کسی اور ڈھنگ سے چھاپتے ہیں۔ اس فرق کا راز کیا ہے۔ غالباً اس فرق کا راز یہ ہے کہ پروفیشنل جرنلزم (professional journalism) کا تصور ابھی تک اردو اخبارات میں نہیں آیا۔

پربھنی میں ۹ ستمبر کو ایک بڑا جلسہ رکھا گیا تھا۔ مگر مجھے بعض اسباب سے ۸ ستمبر کو واپس آنا پڑا۔ چنانچہ پربھنی کا پبلک جلسہ نہ کیا جا سکا۔ البتہ یہ طے ہوا کہ ناندیڑ سے اورنگ آباد جاتے ہوئے درمیان میں کچھ دیر کے لیے میں پربھنی میں رکوں اور وہاں ایک پروگرام کیا جائے۔ اسی فیصلہ کے تحت پربھنی کی مسجد میں خطاب کا ایک پروگرام رکھا گیا۔ پربھنی سے فارغ ہو کر اورنگ آباد کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً ۴ گھنٹہ کا سفر تھا۔ سڑک نسبتاً اچھی تھی اور سڑک کے دونوں طرف مسلسل سرسبز مناظر تھے۔ اس طرح کے ماحول میں سفر کرتے ہوئے ساڑھے چار بجے شام کو اورنگ آباد ائرپورٹ پر پہنچے۔ یہاں سے انڈین ائرلائنز کی فلائٹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ فلائٹ اورنگ آباد سے ساڑھے پانچ بجے شام کو روانہ ہوتی ہے اور بمبئی ہوتے ہوئے نئی دہلی آتی ہے۔

یہاں کے جلسوں میں تقریر کے بعد کثرت سے سوالات کئے گئے۔ بلکہ ہر جگہ سوالات کی بھرمار ہوگئی۔ میں ٹھنڈے طریقہ سے ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ اس درمیان سامعین کی طرف سے ایک کاغذ ملا جس پر یہ لکھا ہوا تھا:

ابھی تک کئے گئے سوالوں میں سے کچھ سوال یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کی بات کبھی بھی سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ماننے والے نہیں۔ اس کے باوجود آپ ان کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ لوگ کبھی سدھریں گے۔ (عبدالسمیع چاؤش)

میں نے کہا کہ کسی انسان کے دل میں سچائی کا اترنا میری تقریر یا میرے جواب سے نہیں ہوتا بلکہ خدا کی توفیق سے ہوتا ہے۔ خدا جب دیکھتا ہے کہ سوال کرنے والا اپنے سوال میں سنجیدہ ہے، وہ واقعی طور پر حق کو جاننا چاہتا ہے تو خدا کی توفیق سے اس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ بات کو سمجھے اور اس کو اپنے دل میں بٹھالے۔ مجھ کو یا کسی کو کسی انسان کے دل کا حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہم پیشگی طور پر کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ہم کو یہی کرنا ہے کہ جب کوئی شخص سوال کرے تو ہم اس کا جواب دیں اور پھر دعا کریں کہ خدا سچی بات کو اس کے دل میں اتار دے۔ اور وہ ایک حق پرست انسان بن جائے۔

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ابتدا میں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص بات کو ماننے والا نہیں ہے۔ مگر بعد کو ایسا ہوا کہ اس شخص نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے سچائی کو مان لیا اور اپنی زندگی کو سچائی کے راستے پر ڈال دیا۔

اورنگ آباد سے دہلی کے لیے سفر کرتے ہوئے کچھ چیزیں مطالعہ میں آئیں۔ انڈین ایرلائنس کا فلائٹ میگزین سواگت (Swagat) کا شمارہ ستمبر ۲۰۰۴ برائے مطالعہ جہاز کے اندر موجود تھا۔ میں اپنے سفروں میں اکثر فلائٹ میگزین کی کوئی چیز نقل کرتا ہوں۔ اس کو دیکھ کر کئی لوگوں کے خط ہمارے پاس آئے کہ ہمیں پتہ بتایئے تاکہ ہم فلائٹ میگزین اپنے لیے حاصل کرسکیں۔ واضح ہو کہ یہ

میگزین جہازوں میں اِن فلائٹ ریڈنگ کے لیے ہوتے ہیں وہ کھلے بازار میں دستیاب نہیں۔

مذکورہ میگزین میں بتایا گیا تھا کہ چراغ دہلی کے علاقہ میں ایک غیر حکومتی تنظیم (NGO) قائم کی گئی ہے۔اس کے بانی وجے جھااور رِند تابکشی ہیں۔اس تنظیم کا نام یہ ہے:

Bisnouli Sarvodaya Gramodyog Sewa Sanstha

یہ تنظیم غریب طبقہ کے لیے ہے۔وہ تین سال پہلے قائم کی گئی ہے۔اس کا ماٹو اپنی مدد آپ ہے اور باعزت زندگی حاصل کرنا اُن کا نشانہ ہے:

Self help is their motto, and a life of dignity their goal. (p. 86)

اس تنظیم میں اب تک تین سو سے زیادہ خواتین شامل ہوچکی ہیں۔اُن میں ایک مسلم خاتون نظر آئیں۔اُن کا نام رخسانہ (۲۰ سال) بتایا گیا تھا۔یہ خواتین مختلف قسم کے کاموں کی تربیت حاصل کررہی ہیں۔مثلاً ٹیلرنگ، کمپیوٹر، انگریزی بولنا، وغیرہ۔

اس طرح کے کام موجودہ حالات میں بے حد اہم ہیں اوران کی سخت ضرورت ہے۔میرے نزدیک عطیات دینا یا مدد پہنچانا زیادہ مفید چیزیں نہیں۔اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تعلیم وتربیت کی جائے کہ وہ اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہوجائیں۔

۱۰ ستمبر ۲۰۰۴ کی شام کو دہلی واپسی ہوئی۔

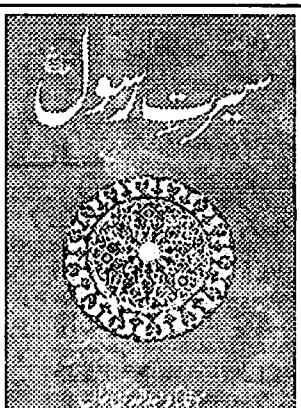

یہ کتاب سیرتِ رسول کا ایک سادہ اور واقعاتی مطالعہ ہے۔اس کتاب میں پیغمبر اسلام کی زندگی کو تاریخ وار انداز میں کسی تشریح یا تعبیر کے بغیر بیان کیا گیا ہے۔یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی کی ایک تاریخی تصویر ہے۔یہ معلوماتی اُسلوب میں سیرتِ رسول کا ایک جامع تعارف ہے۔پوری کتاب اسی بیانیہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18

Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454, Fax (9111) 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com

ORDER FORM (URDU BOOKS)

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل، مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نار جہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	تعدد ازدواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کرچکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلہ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ وقال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیۃ
	80.00	مطالعۂ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت حج
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعۂ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعۂ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	100.00	امن عالم		50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
	100.00	عورت: معمار انسانیت		50.00	ختم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جد وجہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق

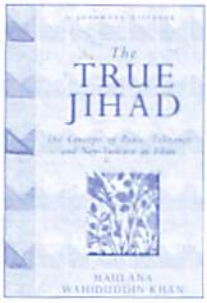

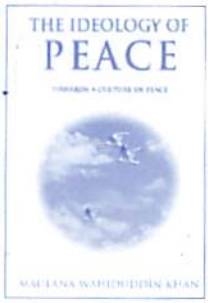

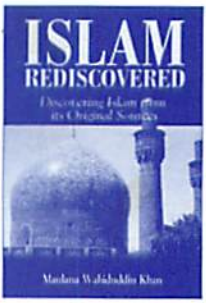

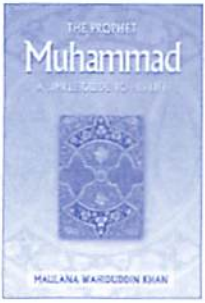

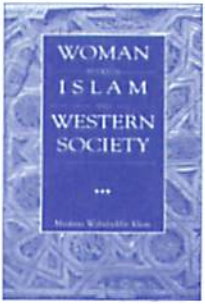

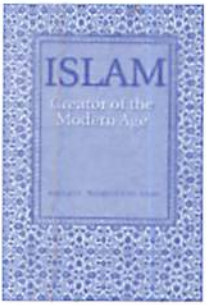

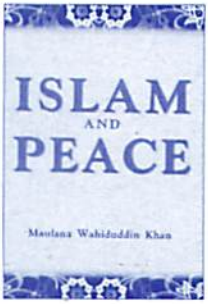

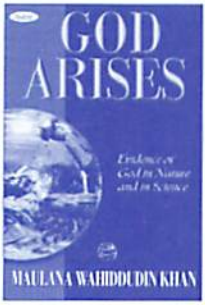

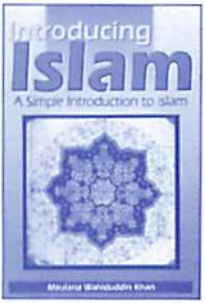

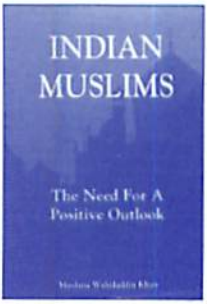

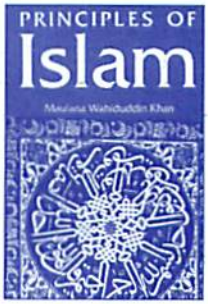

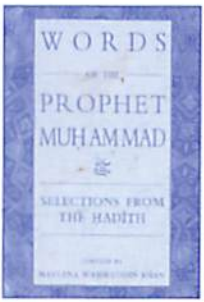

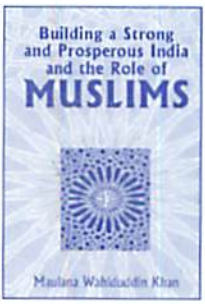

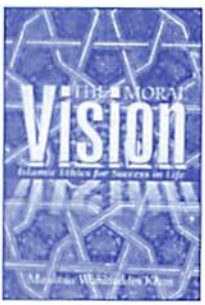

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003-05
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003-05